قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

ماہنامہ

جلد: ۸۷ شمارہ: ۱۲
ذوالحجہ: ۱۴۳۶ھ - اکتوبر: ۲۰۱۵ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ’’بینات‘‘، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465
فون دفتر ’’بینات‘‘: 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 101900-397-7 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر و عبر

حج کے ثمرات و برکات اور ان کے حصول کے اسباب	۳	سید سلیمان یوسف بنوری

مقالات و مضامین

حُجیتِ حدیث	۱۱	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
جاوید احمد غامدی، سیاق و سباق کے آئینہ میں (قسط:۱۱)	۲۳	مولانا فضل محمد یوسف زئی
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی و عرفانی مقام (قسط:۲)	۲۹	جناب محمد ظفر اقبال
تحقیقِ مخطوطات کا بہترین منہج	۴۴	مولانا محمد یاسر عبداللہ
کسبِ معاش اور اسلامی نقطۂ نظر	۵۶	مفتی محمد راشد ڈَسکوی

دار الافتاء

اللہ تعالیٰ کو ’’خدا‘‘ یا کسی اور نام سے پکارنا	۶۲	ادارہ

www.banuri.edu.pk

حج کے ثمرات و برکات

اور ان کے حصول کے اسباب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

لاکھوں فرزندانِ توحید فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین پہنچ چکے ہیں اور کچھ پہنچنے والے ہیں، رحمتِ خداوندی اور مقاماتِ مقدسہ کے انوارات سے بہرہ مند ہورہے ہیں، ہر تنگ وکشادہ مقام ومکان سے ’’لبیک اَللّٰھمَّ لبیک‘‘ کی صدائیں گونج رہی ہیں، حجاج کرام عاشق زار کی طرح کعبۃ اللہ کے دیوانہ وار چکر لگا رہے ہیں۔ اس لیے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ حج جیسی عظیم الشان عبادت سے بھرپور فوائد، ثمرات، انوارات اور برکات حاصل کرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اسے ہدیہ قارئین کیا جائے۔ حجاج کرام کی تربیت کے وقت بہت سی ہدایات اور تعلیمات گوش گزار کرائی جاتی ہیں، یہاں سردست چند چیزوں کی یاددہانی کرائی جاتی ہے، ان کا لحاظ کرنا ہر حاجی کے لیے ضروری ہے، تاکہ حاجی حج کے فوائد وثمرات بخوبی سمیٹ سکے۔

۱:- شعائر اللہ کا ادب واحترام

حج کے مبارک سفر میں شعائر اللہ اور مقاماتِ مقدسہ کا ادب واحترام بہت ضروری ہے۔ جس طرح مقدس جگہوں پر نیکی کرنے کا زیادہ ثواب ملتا ہے، اسی طرح گناہ کرنے پر بھی زیادہ مواخذہ اور گرفت ہوگی۔ لہٰذا مقاماتِ مقدسہ میں قدم پھونک پھونک کر رکھنا ضروری ہے۔ بیت اللہ مرکزِ تجلیاتِ الٰہیہ ہے۔ بیت اللہ کی عظمت اور مقام ومرتبہ کو خود پروردگارِ عالم نے اپنی مقدس کتاب میں جابجا ذکر

www.banuri.edu.pk

فرمایا اور آنحضرت ﷺ کی احادیث میں اس کی حرمت اور تقدس کا بارہا ذکر موجود ہے۔

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

’’بارگاہِ قدس کے مرکز تجلیات کا نام بیت اللہ الحرام اور کعبۃ اللہ ہے..........معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ قیام عالم اور بقاء کائنات کا ذریعہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا یہ گھر دنیا میں باقی رہے گا دنیا قائم رہے گی اور جس وقت اللہ تعالیٰ شانہٗ اس دنیا کو ختم کرنے کا ارادہ فرمائے گا اس کعبے کو ویران کر دیا جائے گا۔ گویا کعبۃ اللہ اور بیت اللہ میں بقاء عالم کا راز ہے۔ یہ مرکز عالم ہے اور اس مرکز کے ختم ہوجانے کے بعد فناء عالم کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ پھر جس طرح عالم کے ظاہری بقاء کا راز بیت اللہ الحرام کے بقاء میں ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی ہدایت ربانی کا سلسلہ بھی اسی بیت اللہ سے قائم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمانی ہدایت وانوار کا فیضان بارگاہِ عرش عظیم سے اس بیت عظیم پر ہوتا ہے اور عالم میں اسی بیت کو منبع ہدایت وچشمۂ ارشاد بنایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ‘‘ (آل عمران:۹۶)

ترجمہ: ’’بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)

بیت المعمور جو ساتویں آسمان پر طواف گاہِ ملائک ہے، اسی کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے روز اوّل ہی سے زمین پر اس مقام کو مرکز تجلیات بنایا اور تاریخ انسانی کے ادوار میں بیت اللہ کی تعمیر ہوتی رہی۔ ملائکہ کرامؑ، انبیاء عظامؑ اور مقربین بارگاہ کے طوافوں، نمازوں، دعاؤں اور نالہ ہائے عشق ومحبت نے اس کو ایسا بقعۂ نور بنادیا کہ عقل حیران ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشاق کو نہ طواف سے سیری ہوتی اور نہ دیدار سے، اور بیت اللہ کی یہی معنویت ہے جس کی وجہ سے اسے نمازوں اور نمازیوں کا قبلہ بناکر مزید بارگاہِ قدس کی تجلیات کا نقطہ ومرکز بنایا گیا۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ جہاں کوئی ایک صالح اور مقربِ بارگاہ جلوہ افروز ہوتا ہے وہاں رحمت خداوندی اور انوار الٰہی کا نزول ہوتا ہے، پس جہاں فرشتوں، رسل وانبیاءؑ اور مقربین بارگاہ کی دعوات وعبادات، تسبیحات وتہلیلات کا مرکز ہو اس کی برکات کا کیا ٹھکانا! حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ کے امیدوار اپنے گناہوں سے توبہ کرکے جہاں عالم کے گوشہ گوشہ سے جمع ہوکر والہانہ انداز میں کبھی آہ وبکا اور گریہ وزاری میں مشغول ہوتے اور کبھی سربسجود ہوتے ہیں، ایسے مقام اقدس کی برکتوں کا کیا کہنا! جس مقام مقدس پر احادیث نبویہ کے مطابق ایک سو بیس رحمتیں

روزانہ نازل ہوتی ہیں، ۶۰ر طائفین کے لیے، ۴۰ر نمازیوں کے لیے، ۲۰ر زائرین ودیدار کرنے والوں کے لیے (شعب الایمان، فضیلۃ الحجر الاسود و المقام و الاستسلام، ج:۳، ص:۴۵۴، ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت) اس کی مقناطیسی کشش کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور جو سعید روحیں تینوں قسم کی عبادتوں سے سرشار ہوں ان کی سعادتوں کا کیا کہنا! الغرض کعبہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا اس عالم میں عظیم ترین مرکز، رحمت ازلیہ کا خزانہ، مغفرت ورحمت کا گہوارہ اور روحانی سیر وسیاحت کرنے والوں کا ربانی مرکزِ ضیافت ہے، جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیض اٹھاتا ہے''۔ (بصائر وعبر، ج:۲،ص:۴۱۰-۴۱۱)

لہٰذا حجاج کرام پر لازم ہے کہ وہ بیت اللہ الحرام اور اسی طرح دیگر شعائر ومقدسات کا ادب واحترام کریں اور ان کی بے ادبی وبے حرمتی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

۲:- اخلاص وخلوص

یہ ہر عبادت کی روح اور شرط اول ہے۔ اخلاص کے بغیر حج کے سفر سے محض اپنے آپ کو تھکانے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ نام ونمود، ریاء، دکھلاوے اور شہرت سے ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے، اس لیے اس مبارک اور عشق ومستی کے سفر میں صرف اللہ کی رضا کی نیت ہونا لازم اور ضروری ہے۔ علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع الزوائد میں امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: نویں تاریخ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات جانے کے لیے منیٰ سے نکلے اور سواری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اٹھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر ایک سادہ سا کمبل پڑا ہوا تھا جس کی قیمت صرف چار درہم تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ دعا تھی: ''**أللّٰهم اجعلها حجة لا رياء فيها ولا سمعة**۔''.....یعنی ''اے اللہ! اس حج کو ایسا حج بنا دے جو دکھلاوے اور شہرت سے پاک ہو (یعنی خالص آپ کی رضا اس میں شامل ہو)۔ (رواہ الطبرانی، مجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۵۳۵۳، ج:۳،ص:۵۰۳)

اس حدیث سے یہ گراں اور قیمتی سبق حاصل ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات اس طرح کے نفسانی اثرات سے پاک تھی، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دعا فرمائی، تاکہ امت اپنے حج میں اخلاص کا خیال رکھے۔

۳:- حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام

حقوق العباد کی ادائیگی پر شریعت اسلامیہ میں خاصا زور دیا گیا ہے۔ زندگی کے تمام مراحل میں اس بات کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے کہ کسی مسلمان بلکہ کسی انسان کا حق بھی ذمہ میں نہ

www.banuri.edu.pk

رہے، لیکن حج کے سفر میں تو اس کا اہتمام اور زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ عبادت کے دوران حقوق العباد کی اہمیت کم لوگوں کے ذہن میں رہتی ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حجۃ الوداع کے موقع پر لوگ آرہے ہیں، لوگ آکر اپنی حج کی غلطیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا رہے ہیں کہ یہ غلطی ہم سے ہوگئی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تسلی دے رہے تھے، لیکن اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات پر تنبیہ فرمائی وہ یہی حقوق العباد کا معاملہ تھا۔ صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک حدیث مبارک نقل کی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

''عن أسامة بن شريک قال: خرجت مع رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم حاجا، فكان الناس يأتوه، فَمِنْ قائلٍ يارسول اللّٰه ! سعيت قبل أن أطوف أو أخرتُ شيئا أو قدمتُ شيئا، فكان يقول لا حرج إلا علٰى رجل افترض عِرْضَ مسلم وهو ظالم، فذٰلک الذی حرج وهلک۔'' (رواہ ابوداود، مشکوٰۃ، باب الحلق، ص:۲۳۳)

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے نکلا، لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے، کوئی کہہ رہا تھا کہ یا رسول اللہ! میں نے سعی طواف سے پہلے کرلی ہے، یا فلاں کام بعد میں کرلیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: کوئی حرج نہیں (یعنی ناسمجھی کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں) ہاں! اس شخص پر گناہ ہے جس نے کسی مسلمان کی آبرو پر ظلماً ہاتھ ڈالا ہو تو اس پر حرج ہے اور وہی ہلاک ہوا۔''

لہٰذا دورانِ حج حقوق العباد کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا جائے۔

۴:- گناہوں سے اجتناب

حج کے انوارات وبرکات حاصل کرنے کے لیے گناہوں سے پرہیز بہت ضروری ہے، اگر خدانخواستہ حج کے سفر میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا رہا تو اُلٹا وبال اور نقصان کا خطرہ ہے۔ حجاج کرام بعض خطرناک قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی حساس اور دردمند دل رکھنے والے تھے، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے حجاج کی چند غلطیوں کو دیکھا تو بہت افسردہ ہوئے۔ ذیل میں حضرتؒ کی ایک تحریر درج کی جاتی ہے، جس میں حضرتؒ نے حجاج کی غلطیوں کا ذکر فرمایا جن سے حجاج کو اجتناب اور پرہیز کرنا لازم اور ضروری ہے، چنانچہ حضرتؒ فرماتے ہیں:

''حج بیت اللہ الحرام.... مسلمان کے لیے یہ فریضہ ادا کرنا گوناگوں برکتوں کا ذریعہ ہے اور حیرت انگیز نعمتوں کا وسیلہ ہے، باوجودیکہ سابقہ مشکلات ختم ہوگئیں اور بہت کچھ

www.banuri.edu.pk

آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں، تاہم دور دراز کا سفر ہے، ہزاروں روپے کا خرچ ہوتا ہے، اکثر لوگوں کو زندگی میں ایک ہی مرتبہ جانا میسر ہوتا ہے اور اب بھی بہت کچھ مشکلات اٹھانا پڑتی ہیں، ایسی صورت میں بے حد ضروری تھا کہ مسلمان اس فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی احتیاط برتیں، مسائل حج سے کامل واقفیت حاصل کریں، اسی لیے ہر زبان میں مسائل واحکام حج سے متعلق چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، تاکہ شرعی قانون کے مطابق صحیح طور پر حج ادا ہوسکے، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مخلوقِ خدا کا یہ عظیم انبوہ جو ملک کے ہر گوشے سے پہنچ رہا ہے، اکثر وبیشتر اس فریضہ کے احکام ومسائل سے بالکل بے خبر ہے، سنن ومستحبات تو درکنار، فرائض وواجبات سے بھی غافل ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا ہی نہیں کہ محظورات وممنوعات کا برابر ارتکاب ہوتا رہا ہے، بلکہ اور تمام گناہوں تک سے بچنے کا ذرہ برابر اہتمام نہیں ہوتا۔ نمازوں کی ادا کرنے میں تقصیر، جماعت کی پابندی میں کوتاہی، حالانکہ ایک فرض نماز بھی حج سے بدر جہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اگر بغیر عذر شرعی ایک نماز بھی قضا کی تو حج قبول ہونے کی توقع مشکل ہوجاتی ہے۔ سفر میں خصوصاً احرام باندھنے کے بعد بجائے تلبیہ کہنے اور ذکر اللہ کرنے کے عام طور پر غیبتیں کرتے ہیں، بکواس بکتے رہتے ہیں، نہ زبان پر قابو، نہ نگاہ پر قابو، نہ ہاتھ پاؤں پر، بلکہ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ مسجد حرام میں بیٹھے ہیں، نماز کا انتظار ہو رہا ہے اور فضولیات بک رہے ہیں، غیبت میں مبتلا ہیں، حالانکہ زندگی کے اس عظیم مرحلے پر پہنچ کر تو تمام اوقات عبادت اور توبہ واستغفار، انابت الی اللہ سے معمور ہونے چاہئیں، تاکہ ان مقدس مقامات کی برکات سے مالا مال ہوں، گناہوں سے پاک وصاف ہوکر ایسے واپس ہوں جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے ولادت ہوئی ہے، دنیا میں دوبارہ آئے ہیں۔

بعض حضرات مستحبات وآداب میں تو غلو کرتے ہیں، لیکن فرائض وواجبات میں تقصیر کرتے رہتے ہیں، اور دور حاضر کے اکثر حجاج کو دیکھ کر تو یہ شبہ ہوجاتا ہے کہ شاید کسی میلہ یا تماشہ کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ عورتوں پر پردہ فرض ہے مگر حرمین شریفین میں پہنچ کر اکثر عوتیں بلکہ ۹۹ رفیصد برقع پوش عورتیں بھی برقع پھینک کر بے حجاب ہوجاتی ہیں اور اس طرح گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوتی ہیں، نہ صرف بے حجاب بلکہ بسا اوقات نیم عریاں لباس میں بیت اللہ کا طواف کرتی ہیں اور افسوس اس کا ہے کہ نہ شوہر اور نہ ان کے محرم حضرات اس بے حجابی کو روکنے کی تدبیر کرتے ہیں، نہ حکومت کی طرف سے اس پر کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ بے محابا مردوں کے درمیان گھستی ہیں، حجر اسود کو بوسہ

دینے کے لیے مردوں کی دھکا پیل میں جان بوجھ کر گھستی ہیں اور پستی ہیں، اجنبی مردوں کے ساتھ شدید وقبیح اختلاط میں مبتلا ہوتی ہیں۔ یہ سب حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے۔ ایسا حج کہ جس میں اوّل سے آخر تک محرمات اور کبائر سے احتراز نہ ہوسکے کیا توقع ہے کہ وہ حج قبول ہوگا؟ حج مبرور کے لیے جزاء جنت بے شک ہے، لیکن حج مبرور کیسے ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے حج مبرور کا بیان فرمایا ہے کہ: ''حج کرے اور اس میں کوئی بھی بے حیائی کا کام نہ کرے، کوئی گناہ نہ کرے، تب گناہوں سے پاک وصاف ہوگا جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔'' (صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب فضل الحج المبرور، ج:۱،ص:۲۰۶، ط:قدیمی)

پاکستان وہندوستان کی بعض عورتیں، مصروشام وغیرہ بعض ملکوں کی عورتوں کو دیکھ کر کہ وہ بے پردہ ہیں خود بھی پردہ اٹھا دیتی ہیں اور حرم میں اس طرح آتی ہیں جیسے تمام مرد اُن کے محرم ہیں یا وہ گھر کے صحن میں پھر رہی ہیں۔ لیکن یہ انتہائی حماقت ہے۔ اگر کوئی قوم کسی گناہ میں مبتلا ہے تو اس سے وہ گناہ جائز نہیں ہوجاتا، پھر دیکھا یہ گیا ہے کہ ان کی بے پردگی یعنی چہرہ کا کھلا ہونا ایک خاص سنجیدگی اور وقار کے ساتھ ہوتا ہے، لباس بھی ان کا سر سے پاؤں تک باحجاب ہوتا ہے، پاؤں تک میں موزے ہوتے ہیں، لیکن پاکستانی عورتوں کا خصوصاً پنجاب وسندھ کی عورتوں کا لباس تو انتہائی بے حیائی کا ہوتا ہے، تمام نسوانی اعضاء نمایاں ہوتے ہیں، بے محابا سینہ تان کر چلتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ عورتیں بھی اس بے حیائی کی وجہ سے معصیت وفسق میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کے شوہر بھی ان کی اس بے حجابی پر گنہگار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ان کو مطلق منع نہیں کرتے، کوئی اصلاح نہیں کرتے، نہ روکتے ہیں، نہ ٹوکتے ہیں، یہ تو کھلی بے حیائی اور بے غیرتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور عام ابتلاء یہ ہے کہ تمام عورتیں پنج وقتہ نمازوں میں مردوں کی طرح حرم میں پہنچتی ہیں، باوجودیکہ عورتوں کے لیے دروازے بھی مخصوص ہیں اور نماز پڑھنے کی جگہیں بھی متعین ہیں، مگر حج کے زمانہ میں چونکہ ازدہام بے حد ہوتا ہے، مستقل جگہ پر نہیں پہنچ پاتیں تو مردوں کے درمیان صفوں میں کھڑی ہوجاتی ہیں اور نماز پڑھنا شروع کردیتی ہیں۔

مسجدحرام اور مسجد نبوی کی نماز اور عورتیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس طرح اپنے وطن میں عورتوں کو تنہا نماز گھروں میں پڑھنا افضل ہے، اسی طرح مکہ ومدینہ میں بھی عورتوں کے لیے نماز گھروں میں تنہا بغیر جماعت کے پڑھنا افضل ہے اور مکہ ومدینہ میں نماز کا جو ثواب حرم اور مسجد نبوی کا ہے وہ ان کو

گھروں پر پڑھنے میں اس سے زیادہ ملتا ہے، جو مسجد میں مردوں کو ملتا ہے۔ ایسی صورت میں حرمین شریفین میں عورتوں کو نماز گھروں میں ہی پڑھنی چاہیے۔ بالفرض کسی وقت بیت اللہ کے دیکھنے کی غرض سے یا طواف کرنے کی غرض سے مسجد حرام میں یا صلوٰۃ وسلام کی غرض سے مسجد نبوی میں آئیں اور نماز باجماعت پڑھ لیں تو ادا ہو جاتی ہے، بشرطیکہ مردوں کے درمیان نہ کھڑی ہوں۔ ایک عورت اگر مردوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے تو تین مردوں کی نماز خراب ہو جاتی ہے: دائیں بائیں کے دو مردوں کی، اس کی محاذات (سیدھ) میں جو مرد کھڑا ہے اس کی بھی، تینوں کی نمازیں فاسد ہو گئیں، بالفرض بغیر ارادے کے کوئی عورت اتفاقیہ طور پر عین نماز کے وقت صفوں کے درمیان پھنس جائے اور نکلنا دشوار ہو جائے یا طواف کرنے کے درمیان نماز کھڑی ہو جائے تو اس وقت اس کو خاموش بغیر نماز کے جہاں بھی ہو بیٹھ جانا چاہیے۔ نماز کی نیت ہرگز نہ کرے، ورنہ مردوں کی نماز بھی خراب ہوگی۔ جب امام نماز سے فارغ ہو جائے تو پھر تنہا وہیں وہ اپنی نماز ادا کر لے۔ عورتوں کو بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے بھی ایسے وقت میں جانا چاہیے جب نماز کا وقت نہ ہو، اس وقت نسبتاً بھیڑ بھی کم ہوتی ہے اور اگر اتفاقاً نماز کا وقت ہو جائے تو اذان ہوتے ہی جلدی جلدی طواف پورا کر کے یا طواف درمیان میں چھوڑ دیں اور جتنے شوط (چکر) رہ گئے ہیں وہ نماز کے بعد جہاں چھوڑے تھے وہیں سے پورے کر دیں، یا اسی طواف کو دوبارہ کر لیں۔ بہر حال گناہ سے بچنا بے حد ضروری ہے اور بھی بہت سی کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان سب میں نماز اور بے پردگی کا مسئلہ میرے خیال میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

بہر حال حج ایک ایسا اہم فریضہ ہے جو زندگی میں بار بار ادا کرنا بے حد مشکل ہے، اس لیے چاہیے کہ مرد ہوں یا عورتیں انتہائی احتیاط کے ساتھ اس فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہوں۔

نیز یہ بھی خیال رہے کہ بعض عورتیں اپنے ملکوں میں بھی پردہ نہیں کرتیں اور گویا مستقل طور پر بے پردہ رہتی ہیں، بلا شبہ یہ گناہ عظیم ہے اور ایک فرض حکم کی خلاف ورزی ہے، لیکن انہیں بھی حج بیت اللہ کے سفر میں تو چاہیے کہ اس گناہ عظیم سے بچیں، تاکہ یہ فریضہ تو صحیح طریقے سے ادا ہو۔ آج کل بہت سی عورتیں بغیر محرم کے سفر کرتی ہیں، یہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ جس عورت کا کوئی محرم نہ ہو اس پر حج فرض ہی نہیں ہوتا، بلکہ محرم ہو بھی لیکن حج پر قادر نہ ہو یا یہ عورت اس کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہ

ہو تب بھی حج فرض نہ ہوگا۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ حج بھی فرض نہ ہوا اور پھر وہاں جا کر حج میں اتنی فروگزاشتیں بھی ہوں؟ جب شرعاً اس کے ذمہ حج فرض ہی نہیں ہے تو یہ حج کا سفر کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟

نتیجہ یہ ہے کہ حجِ بیت اللہ میں حجاج کرام سے اس قسم کی کوتاہیوں اور خلاف شرع حرکتوں کی وجہ سے ہی حج کی برکتیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور باوجود حجاج کی کثرت کے امت جس مقام پر کھڑی ہے وہاں سے روز افزوں تنزل میں جارہی ہے۔ اگر اتنی کثرت سے حجاج کرام صحیح طریقہ پر یہ فریضہ ادا کرتے اور ہم سب کا حج بارگاہِ اقدس میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوتا تو شاید دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ حق تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح فہم اور توفیق خیر نصیب فرمائیں۔ (بصائر وعبر، ج:۲، ص:۴۱۴ تا ۴۱۷)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

☆☆☆

www.banuri.edu.pk

حجیتِ حدیث

افادات: محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب وپیشکش: مولانا محمد عمران ولی

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ہر سال درس بخاری کی ابتدا میں حجیت وتدوین حدیث اور متعلقہ موضوعات پر مدلل ومفصل تقریر فرمایا کرتے تھے، جو بجائے خود علوم حدیث میں حضرت کے وسیع مطالعے کا نچوڑ اور دسیوں اشکالات کا جواب ہوتی تھی۔ پیش نظر مقالہ اسی نوع کی ایک تقریر کا تحریری قالب ہے، جو اس وقت کے درجہ خامسہ کے طالب علم اور بعد کے جامعہ کے استاذ، دارالافتاء کے رکن رکین اور شعبہ تخصص فی الفقہ والدعوۃ والارشاد کے نگران مفتی محمد ولی درویش رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی: ۱۹۹۹ء) کا (بتاریخ: ۲۱ شوال ۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲ء) ضبط کردہ ہے۔ مفتی ولی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی ڈائری سے ہدیۂ قارئین ہے۔

اس زمانہ میں فتنۂ انکارِ حدیث نہایت آب وتاب سے پھیل رہا ہے۔ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کی طرف سے تین متضاد خیالات اشاعت میں آرہے ہیں:

۱:- ''قرآن مجید کے لیے حدیث شریف کی ضرورت نہیں، ہر شخص اپنی سمجھ سے قرآن مجید سمجھ سکتا ہے، اور روایات واحادیث کا سارا سلسلہ سازش ہے۔'' (پرویز، طلوع اسلام، اکتوبر: ۱۹۵۲ء)

مقصد یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمودہ وبیان کردہ تشریحات قطعاً حجت نہیں، یا قطعاً حاجت نہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قولِ رسول، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی واجب الاتباع نہ تھا۔

۲:- ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ مختص تھے، ہر زمانہ کے مطابق اس میں تغیر وتبدل ہوسکتا ہے۔'' (پرویز، معارف، ج:۴، ص:۶۹۲)

جبکہ طلوع اسلام، ماہِ جون: ۱۹۵۰ء، ص: ۴۷، میں یہ ہے کہ: ''آپ علیہ السلام کا فرمان آپ کے زمانہ میں حجت تھا، ہم پر حجت نہیں۔''

۳:- ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول وفعل تو حجت ہے، لیکن چونکہ ہم تک باوثوق ذرائع سے نہیں پہنچا،

www.banuri.edu.pk

اس لیے ظنی ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتماد نہیں رہا۔'' (پرویز، طلوع اسلام، جولائی، ص:۱۹، ص:۴۹، اسلم جیراج پوری، طلوع اسلام، ماہِ نومبر: ۱۹۵۰ء، ص: ۲۳۰)

اگر منکرینِ حدیث کے مختلف گروہوں کے مختلف خیالات ہوتے تو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ عجب امر یہ ہے کہ ایک ہی گروہ بلکہ ایک ہی شخص مختلف آراء اور خیالات کا اظہار کررہا ہے، جسے دیکھ کر دو شقوں میں سے ایک کا تسلیم کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے، یعنی یا تو ان کو مجبور سمجھ کر معذور خیال کیا جائے یا یوں کہا جائے: ان کا کوئی نصب العین معین نہیں ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ، بلکہ اس ساری تگ ودو سے ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ تعلیماتِ رسول اللہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے انکار کرکے ہر طرح سے آزادانہ زندگی بسر کریں، اس لیے جس قسم کا موقع پاتے ہیں بات منہ سے نکالتے ہیں، اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے پہلے کیا بک چکے ہیں۔

ہم قبل ازیں ان کا پول کھولنے کے لیے مختلف مضامین بذریعہ اخبارات ورسائل شائع کرچکے ہیں، جن میں سے بعض مضامین کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس وقت ہم مختلف قسم کے تین نظریوں سے بالاختصار بحث کرنا چاہتے ہیں:

نظریۂ اولیٰ کی تردید

۱:-''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَايَشَاءُ''۔ (الشوریٰ:۵۱)

اس آیت میں اِرسالِ رسول کے مقابلہ میں ذکر کرنا دال ہے کہ بغیر ارسالِ رسول کے بھی وحی ہوتی ہے، یہی حدیث ہے۔

۲:-''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا''۔ (البقرۃ:۱۴۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کی طرف استقبال کا حکم الٰہی تھا، حالانکہ قرآن مجید میں یہ حکم مذکور نہیں۔

۳:-''عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ''۔ (البقرۃ:۱۸۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں رمضان کی رات کو بھی جماع کرنا حرام تھا، یہ حرمت حدیث ہی سے ثابت تھی، قرآن مجید میں اس کا حکم نہیں۔

۴:-''وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ''۔ (آل عمران:۱۲۳)

یہ آیت جنگِ احد کے موقع پر نازل ہوئی، جس میں مذکور ہے کہ بدر کے مقام پر خداوند کریم نے انزالِ ملائکہ کا وعدہ کیا، حالانکہ قرآن مجید میں مقام بدر پر اس قسم کا کوئی وعدہ مذکور نہیں، تو معلوم ہوا

کہ انزالِ فرشتہ وحیِ غیر متلو سے تھا جو کہ حدیثِ رسولؐ ہے۔

۵:- قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کی احادیث ہیں جو حجیت حدیث پر واضح دلیل ہیں، جب انبیاء کرام سابقین علیہم السلام کی احادیث کا ان کی امت پر واجب الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے، تو پھر ہمارے رسول کریم ﷺ کی احادیث کیونکر واجب العمل نہ ہوں گی؟

۶:- قرآن مجید میں جا بجا ''أَطِيْعُوْا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ'' کا ارشاد ہے۔ اگر نبی علیہ السلام کا قول وفعل قابل اعتماد نہیں تو ''أَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ'' جا بجا کیوں مذکور ہے؟ قرآن مجید میں جا بجا اطاعتِ رسولؐ کی تاکید کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر وعید شدید سنائی ہے۔

۷:- ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلٰی الْمُؤْمِنِیْنَ إِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ أٰیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَإِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ۔'' (آل عمران:۱۶۴)

یہ آیت معنی اور مفہوم کے اعتبار سے قطعی طور پر محکم ہے۔ اس میں صاف دلالت ہے کہ رسول کریم ﷺ کا کام ڈاک کے ہرکارے کی طرح ابلاغ ہی نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ حکمت کے مبلغ اور مسلمانوں کے لیے مزکّی بھی تھے۔ تعلیم الکتاب کا جو فرض حضور ﷺ کے ذمہ لگایا گیا تھا آپ ﷺ اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے؟ کیا قرآن کریم کے طلبہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کی کسی آیت کے بارے میں آپ علیہ السلام سے دریافت نہ کرتے تھے؟ اور اگر دریافت کرتے تھے تو کیا آپ ﷺ ان کے جواب میں قرآن ہی کی آیت پیش فرمایا کرتے تھے؟ کیا یہ طریقِ تعلیم قرینِ قیاس ہوسکتا ہے کہ ایک معلم کسی کتاب کی تعلیم دے اور طلبہ سماعِ متن کے علاوہ کوئی اور بات دریافت کریں تو استاذ ان کے جواب میں کتاب کا ہی متن پڑھ دے اور اپنی زبان سے تشریح کچھ نہ کرے؟ معلم کا فرض ہے کہ کتاب کی مجملات کی تفسیر واضح طور پر سمجھائے، طلبہ کے اعتراضات اور خدشات کو حل کرکے کتاب کے مفہوم اور معنی کو واضح کردے اور اچھی طرح سمجھائے۔

اگر قرآن کریم سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ہر شخص اپنے دماغ سے قرآن سمجھ سکتا ہے تو پرویز علیہ ما علیہ نے معارف القرآن لکھ کر حماقت کا ثبوت کیوں دیا؟ حضور علیہ السلام کی تفسیر تو قابل قبول نہ ہو اور گستاخ خاک بدہنش کی تفسیر مقبول ہو۔ حضور علیہ السلام اپنے قول وفعل سے تشریح وتفسیر فرماتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تا زندگی تزکیہ کرتے تھے اور اگر حضور علیہ السلام کا قول وفعل قابل اعتماد نہیں تو پھر آپ علیہ السلام معلم الکتاب اور مزکّی کیسے ہوئے؟

۸:- قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعۂ خواب مذکور ہے، جوکہ وحی متلو (میں موجود) نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہزار تمناؤں کے بعد آخری عمر میں خداوند قدوس نے فرزند عزیز

عطا فرمایا، پھر حالت رضا میں برسوں تک اکلوتے بیٹے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ کر فراق کے صدمے دریافت کیے، مگر خلیل اللہ علیہ السلام کے مقامِ تسلیم رضا کی امتحان کی ایک شدید ترین گھاٹی تا حال باقی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کو وحی الٰہی فرما کر بغیر کسی تردد کے حکم کی تعمیل کے لیے نہ صرف آمادہ ہوجاتے ہیں، بلکہ فرزند لختِ جگر کو قربانی فرمانے کا عمل نہایت مستعدی سے شروع کردیتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نہایت عزیز ترین اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا اقرار کرنا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ''فَافْعَلْ مَاتَرٰی '' کے بجائے ''فَافْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ''اور اللہ تعالیٰ کا ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ''اور ''فَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ '' کا ارشاد فرمانا، پھر اس امتحان کو ''بَلَاءٌ مُّبِيْنٌ '' سے تعبیر کرنا یہ جملہ اس بات کے لیے واضح دلیل ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں ذبح کرنے کا حکم ہوا، اور وہ حکم واجب العمل بھی تھا، غرض یہ کہ حجیت حدیث پر آیات بالا قطعی دلیل ہیں، اس کے بعد کچھ عقلی دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

دلائلِ عقلیہ

ا:.....قرآن مجید میں ہر شئے کا ذکر اجمالاً ہے، جس کی تشریح اور تفسیر احادیث میں ہے۔ نمازوں کے اوقات، تعدادِ رکعات، واجبات کی تفصیل، صوم وصلاۃ کے معاملات اور معاشرت کے احکام وقوانین ان سب امور کی تفصیل حدیث شریف میں ہے اور حدیث ہی سے ثابت ہے۔ پس انکارِ حدیث سارے نظام اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح پیشاب، پاخانہ، کتا، گوہ، گیدڑ وغیرہ کی حرمت کا ذکر قرآن مجید میں نہیں، چنانچہ اسی اعتراض سے بچنے کے لیے منکرین حدیث علیہم ما علیہم ان جملہ اشیاء کی حلت کے قائل ہیں۔

محمد صبیح ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''قرآن میں مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ باقی ہر چیز کا کھانا فرض ہے اور کھانے سے انکار کرنا گناہ ہے اور خدا تعالیٰ کی معصیت ہے۔'' (طلوع اسلام، جون:۱۹۵۲ء)

یعنی کتا، گیدڑ، بلی، چوہا حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ کا کھانا فرض ہے۔ (**نعوذ باللّٰہ من تلک الخرافات**) اس سے ظاہر ہے کہ منکرین حدیث خدا کی معصیت سے بچنے کے لیے شبانہ روزانہ یہ اشیاء کھاتے ہوں گے۔ (**سَوَّدَ اللّٰهُ وُجُوْهَهُمْ**)

۲:.....اگر احادیث کے راوی قرآن کے خلاف عجمی سازش کرنے والے تھے، اس لیے حدیث قابل قبول نہیں تو قرآن بھی انہی وسائل سے ہم تک پہنچا ہے، قرآن پر کیسے اعتماد کرسکتے ہیں؟ (العیاذ باللہ) اگر کہا جائے قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ '' تو ہم کہتے ہیں: خود اس آیت کی صداقت پر کیسے اعتماد ہوگیا؟ کیونکہ یہ بھی انہی لوگوں کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے، جن کی

وساطت سے ہم تک احادیث پہنچی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن حکیم کا اعجاز فی البلاغۃ اس کی صداقت پر دال ہے، اول: تو قرآن کا معجز ہونا من حیث البلاغۃ مختلف فیہ ہے، بعض نے اعجاز عن الغیب وغیرہ کا قول کیا ہے، جس کی صداقت وتصدیق مذکورہ وسائط کے ذریعہ سے معلوم اور منقول ہے۔

ثانیاً: قلیل تغیر اور بعض مواقع پر ترتیب کی تبدیلی سے اعجاز فی البلاغۃ میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، اس پر مختصر المعانی میں بحث کی گئی ہے۔

ثالثاً: اعجاز فی البلاغۃ معیارِ حق تب ہوگا جبکہ تحدی ثابت ہو اور آیاتِ تحدی آیت مذکورہ سے بھی ثابت ہے۔

رابعاً: تحدی من حیث البلاغۃ موجودہ زمانہ میں معیار صداقت نہیں ہوسکتا، کیونکہ تحدی اس چیز کی مفید ہوگی، جس کا دنیا میں بہت زور اور چرچا ہو، ظاہر ہے کہ دورِ حاضر میں بلاغت کی نسبت علم سائنس کا بہت چرچا ہے، پس بلاغت کا لحاظِ تحدی مانۂ تنزیل کے ساتھ مخصوص ہوگی، اس وقت میں اہل بلاغت کی مثل سے عاجز نہیں، بلکہ بلاغت کے مشہور دور میں بڑے بڑے بلغاء اس کی مثل سے عاجز رہے۔ صحابہ کرامؓ وتابعین وتبع تابعین ومن بعد ہم امت مسلمہ جو حدیث کو حجت تسلیم کرتے ہیں، کیا ان سے اجتہادی غلطی ہوئی؟ یا یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے؟ اگر اجتہادی غلطی ہوئی ہے، یعنی حدیث قابل حجت نہیں تھی، مگر اسلاف سے غلطی ہوئی کہ وہ اسے قابل عمل سمجھتے رہے، تو یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ ساری امت کے متقدمین ومتأخرین وصلحاء تمام تر اسلاف اسی غلطی میں رہے، کیا کسی ایک فرد نے اس غلطی کو محسوس نہیں کیا ہے؟ اور اگر اسلاف حدیث کو قابل عمل نہیں سمجھتے تھے، تو کیا جان بوجھ کر حدیثیں بیان کر کے قرآن کے خلاف سازشیں کرتے رہے؟ تو اس امت میں باقی مؤمن کون رہا؟ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ وتبع تابعینؒ، ائمہ محدثینؒ اور جمیع سلف صالحینؒ تو نعوذ باللہ قرآن کے خلاف تھے، اور صرف شیطان پرویز ہی چودہ سو سال کے اندر قرآن سمجھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جو دین چودہ سو سال تک مخالفین کے پاس رہا، اتنی طویل مدت تک اس کا کوئی محافظ اور اُسے قبول کرنے والا پیدا ہی نہیں ہوا، تو ایسے دین پر کیونکر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سابقہ آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطہ سے کیوں اتارا؟ اگر اللہ تعالیٰ ہر فرد بشر کے پاس لکھی لکھائی کتاب بلا واسطۂ رسول بھیج دیتے تو لوگ صریح معجزہ ہونے کی وجہ سے زیادہ متأثر ہوتے اور کفار خود اس بات کے طالب بھی تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر لکھی لکھائی کتاب نازل کی جائے۔

سو اگر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو منہ مانگا معجزہ ملنے پر زیادہ سبب ہدایت ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا اور رسولوں کی معرفت کتابیں بھیج دیں۔ اور رسول بھی صرف انسانوں میں سے

منتخب فرمائے۔ کفار کہتے تھے کہ پیغام پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان سے فرشتہ کیوں نہیں اتارتا؟ تاکہ ہمیں احکام کے منزل ہونے کا یقین ہوجائے، اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ''لَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا'' (الانعام:۹) ''لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا'' (بنی اسرائیل:۹۵) غرض یہ کہ تنزیلِ کتب کے لیے رسولوں کو واسطہ بنانے اور رسالت کے لیے منتخب کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب ضرور کتاب اللہ میں موجود ہے: ''وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ''۔ (النساء:۶۴) یعنی خدا تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے، ان کی بعثت کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ فرمانِ خداوندی عزوجل کے مطابق حکم دیں اور خود قوانینِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کریں اور نازل شدہ احکام پر عمل کرکے امت کے لیے ایک نمونہ قائم کریں، تاکہ امت ان کی تابعداری کرے۔ اور اگر بلاواسطۂ رسول احکام نازل کیے جاتے اور ان کی تفسیر و تفصیل کرنے والا کوئی نہ ہوتا اور ان کو عملی جامہ پہنانے والا کوئی نہ ہوتا تو لوگ آیات کے مفہوم اور معانی میں اختلاف کرتے اور منشأ الٰہی کو سمجھنے میں غلطی کرتے، ان کو سمجھانے والا کوئی نہ ہوتا۔

اس ضرورت کو کسی حد تک فرشتے بھی پورا کرسکتے تھے، مگر ان کے متعلق لوگ خیال کرتے کہ فرشتہ قوتِ نفسانی، شہوانی اور غضب سے منزہ ہے اور انسانی حوائج وضروریات سے مستغنی ہے، اس سے احکام طہارت، پاکیزگی اور تقویٰ میں انسان فرشتہ کی پیروی نہیں کرسکتے، کیونکہ انسان پیٹ رکھتا ہے، کھانے پینے سے پیشاب پاخانہ کرنے کا محتاج ہوتا ہے، قوتِ شہوانی وغضب کا مالک ہے اور وامراض وعوارض کا شکار رہتا ہے، بال بچوں کا جنجال ہوتا ہے، اس لیے فرشتہ کا اتباع انسان کے بس کی بات نہیں، لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم انسان ہیں، ہم میں انسانی کمزوریاں ہیں، ہم فرشتہ کی متقیانہ زندگی کا اتباع نہیں کرسکتے، اس لیے ضروری تھا کہ انسان ہی جذبات وعوارض کے ساتھ بطور پیغمبر مبعوث فرمایا جائے، اس کے لیے وہی معاملات درپیش ہوں جو عام انسانوں کو درپیش ہوں، تاکہ وہ قوانینِ الٰہیہ کے مطابق لوگوں کو زندگی بسر کرکے دکھائے کہ دیکھئے! انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے فعل، عمل اور قول سے ہدایت دیتا اور اس کو سمجھاتا ہے، تاکہ انسانی زندگی کی پیچیدہ راہوں سے بچ کر راہِ مستقیم پر چل سکے۔ غرض یہ کہ لفظوں میں منزلہ احکام کو عملی جامہ پہنا کر امت کے لیے اسوۂ حسنہ قائم کردیتا ہے، بس یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ پیرویِ رسولؐ کو بھی اس کے ساتھ ہم پر لازم فرمادیا۔

نظریۂ ثانیہ کی تردید

اگر رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات صرف آپ علیہ السلام کے زمانہ کے ساتھ خاص تھیں اور حجت نہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت قیامت تک عام نہیں ۔ (حالانکہ) یہ (نتیجہ) غلط ہے، جبکہ مندرجہ ذیل آیات اور ادلہ بھی اس کی صریح تردید کرتی ہیں:

۱:- ''أَطِيۡعُوۡا الرَّسُوۡلَ'' میں قرآنی حکم عام ہے اور قیامت تک کے لیے ثابت رہے گا، اگر ہم پر قرآن حجت ہے تو قرآن کریم کی آیت مقدمہ کا ٹکڑا ہم پر کیوں حجت نہیں ہوگا؟

۲:- ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا''۔ (الاعراف:۱۵۸)

۳:- ''وَمَا أَرۡسَلۡنَاكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِيۡنَ''۔ (الانبیاء:۱۰۷)

۴:- ''وَمَا أَرۡسَلۡنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰكِنَّ أَكۡثَرَ النَّاسِ لَايَعۡلَمُوۡنَ''۔ (السبأ:۲۸)

۵:- ''مَاكَانَ مُحَمَّدٌأَبَا أَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيۡنَ''۔ (الاحزاب:۴۰)

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ کتاب اللہ کے سمجھنے کے لیے معلم کی ضرورت ہے، جب نبی کریم علیہ السلام کے بعد کوئی نبی ورسول نہیں آسکتا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات الی القیامہ واجب الاتباع ہیں۔

۶:- ''رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّايَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةً بَعۡدَ الرُّسُلِ''۔ (النساء:۱۶۵)

دلائل عقلیہ

۱:- کتاب اللہ کے سمجھنے کے لیے معلم الکتاب کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو رسول کیوں مبعوث کیے گئے؟ نیز اگر قول رسولؐ اہل زمانہ پر واجب الاتباع ہے تو ہم ان تعلیمات سے کیسے مستغنی ہوسکتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلم کی ضرورت پڑے اور ہم معاذ اللہ ان سے بھی زیادہ عقلمند بن بیٹھے، کہ وہ باوجود اہل زبان، اہل محاورات ہونے کے نہ سمجھ سکے اور ہم سمجھنے لگ گئے۔

۲:- تمام جمہور یعنی جمیع امت جو آج تک حدیث کو قابل قبول سمجھتی آئی ہے، ان سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے یا جان بوجھ کر بقول پرویز: ''اسلام کے خلاف سازش کرتے رہے ہیں''۔

نظریۂ ثالثہ کی تردید

۱:- منکرین حدیث کہتے ہیں کہ: حدیث ظنی ہے، قرآن کی رو سے ظنی پر عمل کرنا جائز نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کریم کی رو سے حدیث کی پیروی کرنا منع ہے۔ منکرین حدیث کا یہ استدلال دجل وتلبیس ہے کہ لفظ ظن لغوی معنیٰ میں مستعمل ہے یا بالکل بغیر دلیل کے محض گمان اور اٹکل ہے۔

۲:- شواہد اور قرائن سے ظن بمعنی غالب ہے۔

www.banuri.edu.pk

۳:- نیز علم یقینی، نظری استدلالی ہے جو برہانِ قطعی سے حاصل ہو اور اس میں مشاہدہ بھی ہو، مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ میں لفظ ''ظن'' اس علم یقین کے معنی میں مستعمل ہے اور رکھا گیا ہے:

۱:- ''یَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔'' (البقرۃ:۴۶)

۲:- ''قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا اللّٰهِ۔'' (البقرۃ:۲۴۹)

۳:- ''وَظَنَّ دَاوٗدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ۔'' (ص:۲۴)

۴:- ''أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ۔'' (المطففین:۴)

قرآن کریم نے ظن بمعنی اٹکل استعمال کرنا منع کیا ہے۔

احادیث کا سلسلہ (معاذ اللہ) محض اٹکل نہیں ہے، اس لیے ظن کا معنی ثانی یعنی غالب و معنی ثالث یعنی علم یقینی استدلالی ہے اور ظن کو اسی لحاظ سے ظن کہا جاتا ہے، بہت ساری احادیث علم یقینی واستدلالی کا فائدہ بھی دیتی ہیں۔

حضرت علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی:۸۵۲ھ) شرح نخبۃ الفکر میں فرماتے ہیں:

''وقد يقع فيها أي في أخبار الآحاد المنقسمة إلٰى مشهور وعزيز وغريب ما يفيد العلم النظري بالقرائن على المختار۔'' (شرح نخبۃ الفکر، ص:۳۴، ط: قدیمی)

تو صاف ظاہر ہے کہ واجب الاتباع ہیں۔ باقی رہیں وہ احادیث جو ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں، سو شریعت مطہرہ نے ظن کو یقین کا فائدہ دے کر واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ شرعی یقین کے لیے ثقہ عادل کی شہادت کہیں ایک، کہیں دو اور کہیں زیادہ کی کافی ہے، سو وہ احادیث میں موجود ہیں، اس لحاظ سے سب احادیث یقینی ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ مفیدِ علمِ یقینی واستدلالی ہیں۔ یا یہ کہ اکثر احادیث میں عقلاً احتمال موجود ہے، لیکن شرعاً نہیں۔ غرض یہ کہ نتیجہ یہی ہوگا کہ مفیدِ علمِ یقینی واستدلالی شرعی ہیں اور عقلاً اس لیے کہا جاتا ہے کہ بعض احادیث مفیدِ علمِ یقینی استدلالی عقلی ہیں۔ اور اکثر احادیث موجب ظن غالب ہیں اور دنیا میں ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ہم رات اور دن اپنے تمام معاملات میں ظن غالب پر ہی عمل کرتے ہیں، مثلاً: دوا پینے کے وقت شفاء کا یقین نہیں، بلکہ مضرت کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ ریل، طیارہ، بحری جہاز وغیرہ پر سوار ہوتے وقت ان کی مشینری کا کوئی علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ درست ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ راستے کے حوادث سے محفوظ رہنے کا بھی یقین نہیں ہوتا، بلکہ ان تمام صورتوں میں طیارہ گرنے، یا ریل کے پٹڑی پر سے اتر جانے اور بحری جہاز کے سمندر میں غرق ہو جانے کا احتمال بھی ہوتا ہے، باوجود ان احتمالات کے ہم رات دن انہی ذرائع کے ذریعہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بازار سے دودھ، گھی خریدتے وقت، غسل، وُضو کرتے وقت ان کی طہارت کا کامل یقین نہیں ہوتا اور نہ ہی ہوسکتا ہے۔ ان تمام معاملات میں ظن غالب پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر بالفرض ظن غالب کی پیروی

www.banuri.edu.pk

کوترک کردیا جائے تو انسان کا دنیا میں زندہ رہنا محال ہوجائے گا۔

ان معاملات کے علاوہ چند اور مثالیں بھی دیکھ لیں کہ سانپ کے کاٹنے کے بعد مرنے کا یقین نہیں ہوتا، سانپ کے پاس جانے کے وقت کاٹنے کا یقین نہیں، زہر پینے کے بعد موت کا یقین نہیں ہوتا، باہمہ ہذا زہر سے بچتے ہیں، سانپ سے پرہیز کرتے ہیں، ان سب پر ظن غالب ہی کی وجہ سے عمل کرتے ہیں، تو کیا ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اے گروہِ منکرین حدیث! جب ہم زندگی کے ہر معاملہ میں ظن غالب پر یقین رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ حدیث کوظنی ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا جائے؟!!!

یاد رکھئے! قرآن مجید یقینی ہے اور حدیث ظنی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ حدیث کو محض اٹکل سمجھ کر نا قابل اعتماد قرار دیا جائے۔

سنئے! قرآن کے یقینی اور حدیث کے ظنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ہر لفظ تواتر سے ثابت ہے، اس لیے یقینی و بدیہی ہے، اور حدیث میں چونکہ روایت بالمعنی جائز ہے، اس لیے اس کے ہر لفظ کے بارے میں قرآن جیسا یقین نہیں ہوسکتا، لہٰذا حدیث یقینی استدلالی و یقینی شرعی ہے، جیسے کہ ماں (والدہ) کا علم یقینی اور باپ (والد) کا علم ظنی ہوتا ہے، کیونکہ والدہ کے بارے میں یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے، مگر باپ کے متعلق نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا باپ کا علم یقینی شرعی ہے۔

دلیل عقلی

جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ قول رسولؐ قیامت تک واجب الاتباع ہے، مگر حدیث کا موجودہ ذخیرہ حجت نہیں، اس لیے کہ ظن ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے جب تعلیمات رسولؐ کو قیامت تک ہمارے لیے واجب الاتباع قرار دیا ہے، تو اللہ پاک نے ان کی حفاظت کا بندوبست کیوں نہ کیا ہوگا؟ کیا یہ تکلیف مالا یطاق اور امت پر ظلم نہ ہوگا کہ ان اقوال کی اتباع ہم پر واجب کردی گئی جن کی تحصیل ہم پر ناممکن ہے۔ غرض یہ کہ قول رسولؐ کو واجب الاتباع تسلیم کرلینے کے بعد اسے ظنی سمجھتے ہوئے حجت نہ ماننا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کی نسبت کرنے کے مترادف ہے۔

منکرین حدیث کا یہ اعتراض

منکرین حدیث کا یہ اعتراض کہ حدیث رسولؐ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی ہے، صاف دھوکہ ہے، کیونکہ حدیث رسولؐ کی تدوین عہد رسالت ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا کتابت حدیث سے منع فرمانا اسلام کے ابتدائی زمانہ میں صرف اس لیے تھا کہ کہیں قرآن کے ساتھ التباس نہ ہوجائے، کیونکہ اس وقت کتابتِ قرآن کا دستور تھا اور عوام قرآنی اسالیب اور اس کے معجز ہونے سے

ابھی پوری طرح فائز وواقف نہ تھے۔ کتابتِ حدیث سے منع کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ حدیث قابل اعتبار نہیں، اگر یہ مقصود ہوتا تو آپ ﷺ حدیث بیان کرنے سے روک دیتے، حالانکہ حضور ﷺ نے خود فرمایا: ''فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنكُمُ الْغَائِبَ '' حضور ﷺ کے زمانہ میں اوراس کے بعد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں احادیث بیان کرنے کا رواج تھا، جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ایک خدمت پر بھیجتے وقت دریافت فرمایا کہ: تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلے قرآن پر نظر کروں گا، پھر آپ کے قول اور فعل سے استدلال کروں گا، پھر اجتہاد سے کام لوں گا۔ حضور ﷺ نے اس پر اظہارِ مسرت فرمایا اور حدیث کے حجت (ہونے) پر تصدیق ثبت فرمائی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تسمعون ویسمع منکم ویسمع ممن یسمع منکم '' (سنن ابوداود، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم، ج:۲، ص:۱۵۹) شروع میں اگرچہ عوام کو اختلاط بالقرآن کی وجہ سے اجازت نہ تھی، تاہم خاص خاص لوگوں کو کتابت کی اجازت تھی۔

طبقات میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکورہ ہے کہ آپؓ نے دربارِ رسالت میں عرض کیا کہ: یارسول اللہ ﷺ! میں نے آپ سے جو احادیث بالمشافہ سنی ہیں، ان کے تحریر کرنے کی اجازت عطا فرمادیجئے! آپ ﷺ نے بخوشی اجازت عطا فرمادی، پھر آپؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ: یارسول اللہ! کیا میں نشاط کی احادیث ضبط کروں یا غصہ کے وقت کی بھی؟ آپ ﷺ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس منہ سے سوائے حق کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ چنانچہ احادیث کو انہوں نے جمع کیا اور اس کا نام ''الصادقة'' رکھا۔ یہ پورا واقعہ ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العلم'' میں بھی لکھا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے سب سے زیادہ احادیث یاد ہیں، مگر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا: ''إنهٗ كان يكتب ولا أكتب''۔

بخاری شریف اور مستدرک حاکم سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث کا ذخیرہ مکتوبہ موجود تھا۔

حضرت حسن بن عمرؒ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو حدیث سنائی تو آپؓ نے فرمایا کہ: یہ غلط ہے اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر یہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو تحریری کتابوں میں ضرور درج ہوگی، چنانچہ آپؓ نے اپنی کتابوں میں یہ حدیث تلاش کی تو یہ حدیث مل گئی، اس مقام پر منکرین نے دو اعتراض کیے ہیں:

اعتراض اول:..... بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایات منقول نہیں۔

www.banuri.edu.pk

جواب:..... اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری شریف کی روایت میں استثناء منقطع ہے، اس لیے سابقہ جملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیز کثرتِ علم، کثرتِ روایت کو مستلزم نہیں۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ زیادہ تر شام میں رہے ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قیام مدینہ منورہ میں رہا، چونکہ دورِ اول میں علم کا مرکز مدینہ منورہ تھا، لوگ تحقیق مسائل میں مدینہ منورہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اس لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو روایات زیادہ بیان کرنے کا موقع ملا۔

اعتراض دوم:..... مستدرک حاکم میں موجود ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی لکھی ہوئی احادیث موجود تھیں اور بخاری میں ہے: ''لا أکتب''۔

جواب:..... اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود لکھنا نہ جانتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھواتے تھے۔ (فتح الباری، ج:۱،ص:۸۳۰) جب لوگ قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب سے خوب واقف ہوگئے، تو آپ ﷺ نے لکھنے کی اجازت عطا فرمائی، بلکہ لکھنے کا حکم عطا فرمایا اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دینی مسائل اور پیغمبرانہ ہدایات خود لکھوائیں۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور ابوشاہ یمنی کی درخواست پر وہ خطبہ لکھوا کر خود انہیں دے دیا، فرمایا تھا: ''اکتبوا لأبی شاہ'' (مفتاح السنۃ،ص:۱۷۰،طبع مصری) اور بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، فرمایا کہ حضرت عمرو بن حزم رحمہ اللہ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے انہیں ایک مفصل تحریری ہدایت نامہ بھیجا تھا، جس میں صدقات وفرائض وغیرہ کے احکام تھے۔ (مفتاح السنۃ،ص:۱۷۰،طبع مصری)

حضرت مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ کے والد کو بشارت لکھوادی (ابوداود)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العلل'' میں لکھا ہے کہ طائف کے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ان کی ایک کتاب سنائی، خطیبؒ کی روایت کے مطابق حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث کا مجموعہ تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو کتابتِ حدیث کا حکم دیا کرتے تھے۔ (دارمی،ص:۶۸)

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے جامع میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب دکھا کر قسم کھائی اور کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض احادیث کو لکھ کر صحیفہ کی صورت میں اپنے پاس رکھا۔ (بخاری شریف)

بعض کثیر الروایہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہم کی روایات کو ان کے شاگرد روبرو بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ (دارمی۔تہذیب، ج:۴۔ترمذی، کتاب العلل) حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمالِ حکومت کے لیے ''صدقۃ المواشی'' کے احکام لکھ کر رکھتے تھے۔ (المؤطا ،ص:۱۳۵، ط:مصر یا ص:۱۳۶ یا ص:۱۵۱ یا ص:۱۵۲ پر اس قسم کی مثالیں ملاحظہ فرمالیں)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اگرچہ کتابتِ حدیث ثابت ہے، مگراس زمانہ میں حفظِ صدری پر زیادہ زور تھا۔ عرب کے لوگ زیادہ مشہور تھے، مختلف مضامین کے طویل وعریض قصائد اُن کو زیادہ یاد تھے۔ نیز اس کے علاوہ ان لوگوں کو اونٹوں کے، گھوڑوں کے زیادہ تر نسب نامے بھی یاد تھے۔ حضور ﷺ کے قول وفعل کو ان لوگوں نے خصوصیت سے وحی الٰہی سمجھ کر حفظ کیا، اور حضور علیہ السلام کے قول وفعل کو واجب الاتباع سمجھ کراس کی حفاظت کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین ؒ کا زمانہ آ گیا، انہوں نے اقوالِ رسول ؐ کو دنیائے اسلام کے بعید سے بعید گوشہ میں کمالِ حفاظت سے پہنچا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس ذاتی یادداشتیں تحریر شدہ تھیں، مگر کوئی کتاب حدیث کی مرتب نہ تھی۔ پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۰۱ھ) والیِ مدینۃ المنورۃ نے حضرت ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا:

’’انظر ما کان من حدیث رسول اللّٰہؐ ، فاکتبوہ، فإنی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ‘‘

(مفتاح السنۃ ص: ۲۰) اورانہیں یہ بھی لکھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ ؒ (متوفاۃ: ۹۸ھ) اورقاسم بن محمد بن ابی بکر ؒ (متوفی: ۱۲۰ھ) کی احادیث کے مجموعے لکھوا کر میرے پاس بھجوائیں۔ اسی طرح آپ ؒ نے آ کر بڑے بڑے شہروں کے عمال کو اسی طرح کے حکم تدوینِ حدیث کے لیے بھیجے۔ وصلی اللّٰہ علی النبی الکریم

جاوید احمد غامدی

سیاق وسباق کے آئینہ میں (گیارہویں قسط)

مولانا فضل محمد یوسف زئی

موسیقی کے بارے میں علماء احناف کا فتویٰ

پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ ایک موسیقی ہے جو باجوں طبلوں کے ساتھ ہوتی ہے جو آج کل معروف ہے، یہ سب کے نزدیک حرام ہے۔ لوگوں کو التباس اس سے پیدا ہوجاتا ہے کہ صوفیوں کے محافل سماع پر بھی موسیقی کا گمان ہوجاتا ہے۔ مسئلہ سماع میں تو اختلاف ہے، مگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غنا ومزامیر میں بھی اختلاف ہے، یہ خیال غلط ہے۔ دوسرا التباس مجرد اشعار گانے سے بھی پیدا ہوجاتا ہے، اس کو بھی گانا کہا جاتا ہے، حالانکہ تنہا آدمی مجرد اشعار گاتا ہے اور وحشت دور کرتا ہے، اس کے جواز میں بھی اختلاف نہیں ہے، اگر چہ مالکیہ اس کو بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔ اب علماء احناف کے مختصر فتاویٰ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ مسئلہ صاف ہوجائے۔

بدائع الصنائع میں علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

جس مغنی (گویّے) کے گرد لوگ گانے سے مزے لینے کے لیے جمع ہوجاتے ہوں وہ عادل نہیں، خواہ شراب نہ بھی پیتا ہو، کیونکہ وہ بدکاروں کا سرغنہ ہے۔ البتہ اگر وہ ہی تنہائی میں وحشت دور کرنے کے لیے گائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ مجرد اشعار کے سماع سے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، البتہ فاسقانہ انداز میں مزے اُڑانے کو حلال نہیں کہا جاسکتا ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی آلۂ موسیقی سے شغل کرتا ہو تو دیکھا جائے گا کہ وہ آلہ فی نفسہ برا ہے یا نہیں؟ اگر فی نفسہ برا نہ ہو جیسے بانس اور دف تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور وہ شخص عادل ہی رہے گا اور اگر وہ آلہ شنیع اور برا ہو جیسے عود اور باجے وغیرہ تو اس شخص کی عدالت ختم ہوجائے گی، کیونکہ یہ (عود، وغیرہ) کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہیں۔ (بدائع الصنائع، ج:۶، ص:۲۶۹)

خلاصۃ الفتاویٰ کا فتویٰ

علامہ محمد طاہر بن احمد بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فتاویٰ میں ہے کہ ملاہی جیسے بانسری وغیرہ کی آواز سننا حرام ہے، اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ استماعِ ملاہی یعنی موسیقی سننا گناہ ہے اور اس کے لیے اہتمام سے بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا کفر ہے (زجراً وتوبیخاً)۔ (خلاصۃ الفتاویٰ، ج:۴،ص:۳۵۴)

صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

صاحب ہدایہ شیخ الاسلام علی بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مغنی (گویّے) کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ وہ لوگوں کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے لیے اکٹھا کرتا ہے۔ (الہدایہ، کتاب الشہادات، ج:۳،ص:۱۶۲)

اوپر کی عبارت کی شرح میں صاحب فتح القدیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ لہو ولعب کے لیے یا مال کمانے کے لیے گانا گانا حرام ہے۔

البحر الرائق میں ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

فتح القدیر کی اوپر والی عبارت کی مزید تشریح وتفصیل میں علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: بزازی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مناقب'' میں ایسے گانے کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے جو آلات موسیقی جیسے: عود وغیرہ کے ساتھ گایا جائے۔ غناء مجرد (خالی گانے) کے بارے میں اختلاف ہے۔ شارحین نے اس بارے میں (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وصاحبین رحمہما اللہ سے) کوئی تصریح نقل نہیں کی ہے، البتہ ''بنایہ'' اور ''نہایہ'' میں ہے کہ لہو ولعب کے لیے گانا گانا تمام آسمانی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ اس روایت کی عربی عبارت اس طرح ہے: ''**الغناء حرام فی الأدیان کلھا**'' (البحر الرائق، ج:۷،ص:۹۶)

خلاصۂ کلام

۱:- مذہب حنفی کی روایات اور مشائخ حنفیہ کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو آلات گانے کے بغیر بھی کیف ومستی پیدا کرتے ہوں وہ حرام ہیں، اسی حرمت میں وہ ''دف'' بھی داخل ہے جس میں گھنگھرو لگے ہوں۔ (کذا فی البحر ورد المختار)

۲:- مندرجہ ذیل چند شرائط کے ساتھ اپنے لیے گانا یعنی محض اشعار سننا جائز ہے:

پہلی شرط یہ ہے کہ گانا محض لہو ولعب کے لیے نہ ہو بلکہ اچھا مقصد پیش نظر ہو، مثلاً: تنہائی میں وحشت دور کرنا، اونٹ کے لیے حدی خوانی کرنا، مسافت طے کرنا یا بچے کو سلانا مقصود ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ گانا پیشہ ور مغنیوں اور قواعد موسیقی کا خیال رکھتے ہوئے نہ گایا جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اشعار کے مضمون میں کوئی مکروہ یا حرام بات نہ ہو، مثلاً: کسی کی غیبت واستہزاء مقصود نہ ہو۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ گانے کی عادت نہ بنائی جائے بلکہ کبھی کبھار گا یا جائے اور خیال رکھا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی واجب امر ترک نہ ہو یا کسی گناہ میں ابتلاء نہ ہو جائے۔ (اسلام اور موسیقی، ص:۲۷۶)

موسیقی کے بارے میں شوافع کا فتویٰ

شوافع کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اجنبی عورت یا امرد سے گانا سننا خواہ موسیقی کے بغیر ہی کیوں نہ ہو قطعاً حرام ہے، چنانچہ شیخ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ جو شافعی مکتبِ فکر کے عالم ہیں حرمت غناء پر اپنی مشہور کتاب ''**كف الرعاع عن مسئلة الغناء**'' میں لکھتے ہیں: کسی آزاد عورت یا اجنبی باندی کا گانا سننا ان لوگوں کے بقول ہمارے ہاں بھی حرام ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے، خواہ فتنہ کا اندیشہ ہو یا نہ ہو۔ (بحوالہ اسلام اور موسیقی، ص:۲۷۸)

قاضی ابو طیب رحمۃ اللہ علیہ نے جو فقہاء شافعیہ کے امام ہیں، اپنے مشائخ سے نقل کیا ہے کہ اجنبی عورت سے گانا سننا ہر حالت میں حرام ہے، خواہ عورت پردے کے پیچھے ہی کیوں نہ بیٹھی ہو۔ قاضی ابو الحسین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اجنبی عورت سے گانا سننے کی حرمت کی تصریح کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

امام اذرعی رحمۃ اللہ علیہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اجنبی عورت یا امرد لڑکے سے گانا سننا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ (حوالہ بالا)

علمائے شافعیہ کا اتفاق ہے کہ جو غناء کسی واجب کے ترک کا سبب بنے یا جس کے ساتھ کوئی حرام یا مکروہ چیز مل جائے وہ حرام ہے۔ (کف الرعاع واحیاء علوم الدین)

شوافع علماء کے نزدیک یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ جو آلات گانے کے بغیر بھی کیف ومستی پیدا کریں اور جنہیں بالعموم پیشہ ور گویّے ہی استعمال کرتے ہوں ان کا استعمال حرام ہے۔ (احیاء علوم الدین)

شوافع کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صاف ستھرے مضامین پر مشتمل اشعار کو خوش الحانی اور حسن صوت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ پیشہ ور گویّوں کی طرح بے جا تکلف سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی اتار چڑھاؤ، آہنگ کے زیر و بم اور موسیقی کے فنی قواعد کا بقصد واختیار اہتمام کیا جائے۔ یہی ان احادیث کا محمل ہے جن سے گانے کی اباحت معلوم ہوتی ہے اور جن میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اشعار کا گانا سننا ثابت ہوتا ہے۔ (کف الرعاع بحوالہ اسلام اور موسیقی، ص:۲۸۱)

خلاصہ یہ کہ شوافع کے ہاں مزامیر کے ساتھ موسیقی مطلقاً حرام ہے۔ یاد رہے اردو میں صرف

اشعار پڑھنے کو بھی گانا گانے سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ گانا بجانا ایک ایسا لفظ ہے جو خالی اشعار پڑھنے پر نہیں بولا جاتا ہے، بلکہ باجے اور سارنگی طبلے کا پورا مفہوم اس میں پڑا ہے، اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ صحابہؓ نے گانا سنا ہے، کیونکہ وہ صرف اشعار کے گائے جانے کا اطلاق ہے جو وحشت دور کرنے کے لیے یا فن ادب میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے جو جائز ہے۔ اسی طرح لفظِ سماع بار بار استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے جواز میں اختلاف ہے، تو یاد رکھنا چاہیے کہ سماع صوفیاء کے ہاں الگ چیز ہے، اس کا معروف گانوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، پھر بھی جمہور کے نزدیک ممنوع ہے۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے سماع کے بارے میں خوب فیصلہ سنایا ہے، فرمایا کہ: ’’سماع کی کامل کو ضرورت نہیں، ناقص کو اجازت نہیں۔‘‘

موسیقی کے بارے میں مالکیہ کا فتویٰ

فقہ مالکیہ کی مشہور کتاب ’’المدونة‘‘ میں ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دف اور باجے کو شادی بیاہ کے موقع پر بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ میں نے خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے اس کی تضعیف کی تھی اور اسے ناپسند کیا تھا۔ ’’المدونة‘‘ کتاب ہی میں ’’کتاب الشهادات‘‘ کے تحت لکھا ہے: ’’نوحہ کرنے والی یا گانا گانے والی عورت کے بارے میں، میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے سوا کچھ نہیں سنا کہ اگر وہ ان کاموں میں مشہور ہوں تو ان کی شہادت و گواہی قبول نہ کی جائے۔

(بحوالہ اسلام اور موسیقی، ص: ۲۹۸)

مالکی مذہب کے مشہور عالم علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ ’’کتاب الاعتصام‘‘ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک اشعار کا معاملہ ہے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ آدمی کے لیے ایسے اشعار پڑھنا جائز ہیں جو فحش گوئی اور دوسری معصیتوں سے خالی ہوں۔ اسی طرح دوسرے شخص سے سننا اس حد تک جائز ہے جس حد تک رسول اللہ ﷺ کے سامنے اشعار سنائے گئے ہیں یا صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور دوسرے بزرگان دین کا اس بارے میں عمل رہا ہو، کیونکہ (خیر القرون میں) اشعار ہمیشہ کچھ فوائد اور منافع کے لیے ہی پڑھے اور سنے جاتے تھے، جن میں چند فائدے درج ذیل ہیں:

۱:.....رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے کفار و مشرکین کو جواب دینا۔

۲:.....اپنی ضروریات اور حاجات کو اشعار میں بیان کیا کرتے تھے اور انہیں پورا کرنے کے لیے اشعار کو ذریعہ بنایا کرتے تھے۔

۳:.....سفر جہاد میں سفر کو مختصر کرنے کے لیے اور میدان جنگ میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے پڑھتے تھے۔

۴:.....اپنے آپ اشعار سے وعظ حاصل کرنے کے لیے اور دوسروں کو نصیحت کے لیے اور حکمتوں سے بھرے اشعار سے فائدہ لینے کے لیے پڑھا کرتے تھے، پھر وہ لوگ آواز بنا بنا کر اور خوبصورت دُھنوں کا لحاظ رکھ کر نہیں گایا کرتے تھے، بلکہ محض فطری سادگی کے ساتھ بناوٹ اور تصنع کے بغیر پڑھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والوں کی روش کو علماء مکروہ کہتے تھے، حتیٰ کہ جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اہل مدینہ میں رائج غناء کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: یہ تو فساق کا شیوہ ہے۔ (اسلام اور موسیقی، ص:۲۹۸ و ۳۹۲)

موسیقی کے بارے میں علماء حنابلہ کا فتویٰ

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نہایت واضح انداز میں لکھتے ہیں کہ: باقی رہا وہ گانا جو آج کل معروف ومشہور ہے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ناجائز ہے، اگر ان کو معلوم ہوتا کہ لوگوں نے اس معاملے میں کیا کیا جدّتیں پیدا کی ہیں تو خدا جانے وہ کیا حکم دیتے۔ (تلبیس ابلیس، ص:۲۹۷)

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ: گانے کے بارے میں فقہاء حنابلہ کا قول یہ ہے کہ مغنی اور رقاص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ (بحوالہ اسلام اور موسیقی:۳۱۵)

مشہور حنبلی عالم علامہ علی بن سلمان مرادی مختلف فقہاء حنابلہ کے اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں: مصنف رعایہ لکھتے ہیں کہ ایسا گانا اور نوحہ سننا جو آلات موسیقی کے ساتھ نہ ہو مکروہ ہے اور جو آلات موسیقی کے ساتھ ہو وہ حرام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ گانے کا سننا آلات موسیقی کے بغیر خواہ مرد سے ہو یا عورت سے ہو مطلقاً حرام ہے۔ اگر کوئی شخص گانے پر مداومت اختیار کرے یا اس کو اپنا پیشہ بنالے یا اپنے غلام یا باندی کو بطور مغنی استعمال کرے اور لوگ اکھٹے ہوتے ہوں تو ایسے شخص کی شہادت مردود ہے۔ (الانصاف، ج:۲،ص:۵)

مجموعۃ الحفید، صفحہ:۱۹۹ پر لکھا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ تمام بلاد اسلامیہ کے علماء کا غناء ومزامیر کی کراہت اور ممانعت پر اجماع ہے، لہٰذا اس کے جواز اور رخصت کا دعویٰ وہی شخص کرسکتا ہے جو قلتِ علم یا جہل مرکب اور خواہشات نفسانی کا شکار ہو۔ (اسلام اور موسیقی:۳۱۷)

آلاتِ موسیقی کے بارے میں حنابلہ کا موقف بہت سخت ہے۔ خود امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک لڑکے کے ہاتھ میں طنبورہ دیکھا تو چھین کر اسے توڑ دیا۔ عمرو بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبلؒ کو دیکھا جب ان کے پاس ایک کھلا ہوا ستار لے جایا جارہا تھا تو آپ نے کھڑے ہو کر اسے توڑ دیا۔

ابوبکر مروزی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے طنبورہ توڑنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں اسے توڑ دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ وہ چھوٹا طنبورہ بھی جو چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، فرمایا: ہاں! وہ بھی توڑا جائے گا، جب کبھی طنبورہ کھلا ہوا نظر آجائے تو اسے توڑ دو۔ (اسلام اور موسیقی، ص:۳۲۳)

یحییٰ بن یزدان کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ ایک شخص عود، ستار طنبورہ، بانسری بجاتا ہے، کیا اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی؟ اور اگر معاملہ سلطان تک پہنچ جائے تو کس حد تک تعزیر دی جاسکتی ہے؟ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا: ہاں! اس کی تادیب کی جائے گی اور میں سمجھتا ہوں کہ تعزیر دس کوڑوں سے زیادہ نہ ہو۔ (اسلام اور موسیقی:ص:۳۲۴)

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ گانا گانے کے لیے کبھی کبھی لفظ مکروہ استعمال کیا جاتا ہے تو اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ لفظ مکروہ کی کیا حیثیت ہے؟ متقدمین کے نزدیک اس کا کیا مفہوم تھا اور متأخرین کے نزدیک کیا مفہوم ہے؟ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر عمدہ کلام کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ''أکرھهٔ'' اور ''لایعجبنی'' کے الفاظ حرام کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور یہ استعمال بہت زیادہ ہے۔ فقہ حنبلی میں ایک چیز صریح حرام ہوتی ہے، لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کو مکروہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں تو اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ اس نے غناء ومزامیر کو مکروہ لکھا ہے یا کسی اور امام نے مکروہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے حرمت غناء مراد لی جاتی ہے۔ (اسلام اور موسیقی، ص: ۳۲۰)

آمدم برسرمطلب

تصاویر اور موسیقی سے متعلق غامدی صاحب نے اپنے منشور ص: ۱۳۱ پر جو لکھا ہے کہ تصویر اور موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ ان میں سے کوئی بھی اصلاً ممنوع نہیں ہے۔ جاوید غامدی صاحب کی اس ایک سطر کی گمراہ کن بات کے جواب میں میں نے بہت کچھ لکھ دیا۔ دوسطروں میں بھی اس کا جواب دیا جاسکتا تھا، لیکن میں نے ان دوموضوعات سے متعلق شریعت اور اسلام کا نقطہ نظر مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھا ہے۔

مجھے اس لکھنے میں جو شدید محنت اٹھانی پڑی ہے، میں اپنے رب سے اس کے ثواب کی یقینی امید رکھتا ہوں اور مجھے جو تکلیف پہنچی ہے اور وقت صرف ہوا ہے میں اس ایذارسانی کا ذمہ دار جاوید غامدی صاحب کو قرار دیتا ہوں۔ اگر وہ دین اسلام کی سیدھی سیدھی بات لکھ دیتے تو دین کی خدمت ہو جاتی، مجھ جیسے ضعیف العمر کو تکلیف نہ پہنچتی اور مخلوق خدا کو فائدہ پہنچ جاتا، لیکن اس نے ٹیڑھی بات لکھ دی جس سے مخلوق خدا کو نقصان پہنچا۔

نیز میں اپنے بلا واسطہ یا بالواسطہ تمام شاگردوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جاوید احمد غامدی کے فتنے سے اپنے آپ کو بچائیں اور مخلوق خدا کو بھی اس گمراہی سے بچائیں اور علمی میدان میں اتر کر اس فتنے کا ہر جگہ علمی مقابلہ کریں اور اگر میرا کوئی شاگرد بلاواسطہ یا بالواسطہ اس فتنے کا شکار ہو چکا ہے تو وہ فوراً توبہ کرے۔ **(جاری ہے)**

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی وعرفانی مقام

جناب محمد ظفر اقبال

(دوسری قسط)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ : مجاہدانہ سرگرمیوں کی عدمِ قبولیت کے خوف سے گریہ

دین کی سربلندی اور خلافت اسلامی کی بقا واستحکام کے لیے زندان واسیری، عبادات واذکار کی پابندی اور ترجمۂ قرآن کی سعادت کے باوصف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت یہ تھی کہ:

''جس وقت مالٹا میں تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، ساتھیوں نے پوچھا: کیا حضرت گھبرا گئے ہیں؟ یہ لوگ سمجھے کے گھربار یاد آرہا ہوگا یا جان جانے کا خوف ہوگا۔ فرمایا کہ: میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں جو تم سمجھے ہو، بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ مقبول بھی ہے یا نہیں؟!''(۱)

حسنِ خلق بھی عبادت ہے

ذوقِ عبادت اور بندگی کا ایک اہم، عظیم اور غالب حصہ مخلوقات سے معاملات اور تعلقات سے متعلق ہے، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الخلق عیال اللّٰہ، فأحب الناس إلٰی اللّٰہ من أحسن إلٰی عیالہٖ۔''(۲)

''مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت اس شخص سے ہے، جو اس کے کنبے سے حسن سلوک سے پیش آئے''۔

عام طور پر یہ بات قابل مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ یا عالم درس وتدریس، تصنیف وافتاء یا صوفیانہ امور میں مشغول رہتا ہے تو اسے بالعموم کاروبارِ دنیا اور لوگوں سے میل جول اور تعلق واختلاط سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے، بلکہ پیش قدمی کرکے اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ فی زمانہ مؤخر الذکر غفلت اور اول الذکر انہماک ہی کو سلوک وعرفان کی معراج سمجھا جانے لگا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ رویہ فی الحقیقت سیرت نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ واہل بیتؓ اور اخلاقِ صوفیہ تینوں کے منافی ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی غیر متوازن شخصیت کا غماز بھی

www.banuri.edu.pk

ہے جو دین کے ایک بہت اہم اور بڑے حصے سے خود کو اپنی ان انفرادی ''ذمے داریوں'' کے باعث مستثنیٰ سمجھنے لگتا ہے، جس کے حصول اور جس کی ادائیگی کے لیے نصوص میں متواتر ترغیب وتحریص دلائی گئی ہے:

طریقت بہ جز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: ذوقِ عبادت اور حسنِ خلق کے جامع

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسلاف کے طریق کی اتباع و پیروی میں عبادت و اخلاق دونوں کے توازن کا مظہر تھے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے عبادات ومعاملات کے مابین توازن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔ دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک وتصوف کے تمام اشغال نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔ غرض کہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتا۔ مہمانوں کی کثرت، ان کی دیکھ بھال اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور اہلِ بیت کے حقوق کی ادائیگی، غرض کہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ باجماعت، ادائے اوراد و وظائف اور قیام اللیل سے مانع نہ ہوتی تھی''۔ (۳)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: طالبان علوم سے تعلق اور شفقت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ' دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ ظاہر ہے طالبان علوم سے ان کا سابقہ واسطہ ہمہ وقتی تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے احوال کا مطالعہ اس بات کو واضح کردیتا ہے کہ آپؒ طالبان علوم کے لیے بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''(شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو) طالب علموں سے بے حد انس تھا''۔ (۴) آپؒ کا علمی رعب اور آپؒ کی عرفانی وجاہت آپؒ کے اور طلبہ کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی۔ طلبہ بے تکلف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک دن طلبہ نے کہا:

''حضرت تیرنا سکھلادیجیے۔ چنانچہ جمعے کے دن سویرے طلبہ کو ہمراہ لے کر دیوبند سے باہر تالاب پر گئے اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالب علم نے کہا: حضرت! لائیے! میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کردی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا جسم بہت نرم تھا، طالب علم نے سمجھا میل بہت ہے، اس لیے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا، جس کی وجہ سے کھال چھِل گئی، مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو

دیکھا جس کی کمر سے خون جاری تھا، پنجابی طالب علم نے کہا: کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا: جی ہاں! کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی''۔ (۵)

اللہ اکبر! ایک تو طلبہ پر شفقت کا یہ عالم، اس طالب علم کی غلطی اور اپنی تکلیف پر ادنیٰ گرانی کا اظہار کیے بغیر بات کو مزاح میں ٹال دینا یہی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصف تھا۔

شیخ الہندؒ: بے نفسی اور عاجزی کا عظیم مظہر

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی و تواضع ہے۔ اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔ یہ خود کو محض ہیچ مداں، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں، بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعتِ قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اس کے انداز و اطوار حاکمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل دنیا اور امراء اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے ...... ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے۔''(۶)

وہ بداہتہً خود کو ہر کمال اور عظمت سے مُعَرَّا باور کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''اس رفعتِ شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا، یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اُسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی۔''(۷)

اس سلسلے میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔ یہ عاجزی و فروتنی آج بھی عوام سے زیادہ خواص سے اتباع و تقلید کا مطالبہ کررہی ہے۔ قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھا دی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا۔ موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا

کہ آؤ بھئی! مسجد کے لیے کسیر لے آویں۔ چار طلبہ کے ساتھ ہو لیے، انہیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھڑ بنائے۔ طلبہ نے عرض کیا کہ: حضرت! پانچ گٹھڑیاں کیوں بنائی گئی ہیں؟ ہم تو چار ہیں۔ فرمایا: اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھڑیاں تو طلبہ کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی۔ ہر چند طلبہ بہ ضد ہوئے کہ حضرت! اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کر دی جائیں، ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبہ کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا، شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گزرا، ان طلبہ کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گزرنے پر کچھ عار آ رہا ہو، لیکن حضرتؒ کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گزر رہے تھے۔ دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی۔‘‘(۸)

قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، للّٰہیت، شفقت، محبت اور حسن ادا سب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحبؒ لکھتے ہیں:

’’میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا قیام تھا، اس زمانے میں طلبہ میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبہ کی طرح فرشِ زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی۔ ایک دن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گزر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا: محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے، مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا، گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انہیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے

ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا: جناب! یہ لے جاؤ اپنی چارپائی، مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں، مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہوگئے۔ مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انہیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنیً ثناءِ حسن ہوجاتی۔'' (۹)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: بہ یک وقت اپنے معمول کی پابندی اور طلبہ کی رعایت

قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے۔ گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے۔ حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعے کا پورا دن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزار کر اذانِ عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشاء دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلبہ نے اصرار کیا کہ حضرت! ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ فرمایا: اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلبہ کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلبہ اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چنانچہ کمہار ٹٹو لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آگیا۔ حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلبہ بھی حاضر تھے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ: بھائی میاں محمود! پہلے تم سوار ہو، پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے۔ انہوں نے حضرتؒ کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرتؒ نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کردیا۔ دو طلبہ اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے، بلکہ ایک قمچی لے کر ٹٹو کو ہنکانا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں، مگر مجبور تھا، حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرتؒ نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں۔ چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہوگیا، مگر خود نہیں چڑھے، باری باری ان طلبہ کو بٹھاتے رہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا،

بلکہ ان طلبہ کے لیے شفقۃً لیا گیا تھا۔ جمعہ کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ: میں نے کہا: ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں، مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسبِ معمول طلبہ پر زور دیا کہ سوار ہو، مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے، عرض کیا کہ: حضرت! آتے ہوئے ہم سوار رہے، اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں، مگر ابتدا حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرمالیا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلبہ نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیو بند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہو گئے تو انہوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلبا کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آگئی جو دیو بند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو! ندی آگئی اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اترے۔ فرمایا: بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا، لو جلدی سے تم سوار ہو۔ طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا، مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے، کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا۔ شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبہ سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قمچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں۔ جس سے طلبا بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی۔ سبحان اللہ! بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔(۱۰)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: اتباعِ شیخ کا مثالی نمونہ

اس مقام پر اگر چہ یہ واقعہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے معمول کی پابندی اور طلبہ کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازلِ سلوک و احسان میں شیخ کی اتباعِ کامل کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اُسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے

روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیو بند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ایک دفعہ:

’’شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی تھی، پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! وہ ساتھ جانے پر تیار ہوگیا، چناں چہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس ہورہا تھا۔ حضرت امام ربانی [گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتداءً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کردیا کرتے تھے اور جب معذور ہوگئے تھے تو سفر ترک فرمادیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہوجانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کردیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے۔ غرض حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کردیا اور فرمایا: ابھی واپس جاؤ۔ آپ [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے: شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ محشی ابوداود کے بھائی، انہوں نے عرض کیا: حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت (گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) نے ارشاد فرمایا: میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں، میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمعے میں ہوکر، ان کے ذریعے اس مجمعے کی رونق تو بڑھی، ’’من کثر سواد قوم فھو منھم‘‘..... ’’جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے‘‘ وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی براءت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھالو۔ اس پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا کہ: ’’حضرت تو فرماویں ابھی چلا جا، میں کس منہ سے کھاؤں!‘‘ چنانچہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہوگئے، پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے‘‘۔ (۱۱)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت، ۲۲ میل کا پیدل سفر

جس انسان کا نفس اس درجے مزکی اور مطہر ہو چکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ جن سے اسے علم وفضل اور صلاح وتقوی بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو، کی محبت

سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھئے! ایک مرتبہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بخار تھا، زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہوکر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲رمیل کا راستہ پیدل طے کیا۔ (۱۲)

۲۲رمیل کا پیدل سفر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کردیا ہو۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت

چلئے!!! حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تو استاذ تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی، لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کردینے والا ہے جو استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت نانوتویؒ کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے، قیام شیخ الہندؒ کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا..... ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہوگیا، اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف (برتن) بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کردی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوند! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔" (۱۳)

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر

اس خدمت و محبت اور مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و رفعت کو ثریا تک پہنچادیا۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین و ذکی تلامذہ

ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا نام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریزؒ کے ساتھ۔ یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے‘ کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔“(۱۴)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ‘ حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیازمندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو نظر پڑ جاتے تو حضرتؒ چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ صاحب مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔(۱۵)

یہ تو براہِ راست مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھئے! قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: جب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ: حضرت! ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرما لیجیے! تو ازراہِ تفنن فرمایا:

”لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لا کر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا: مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے“۔(۱۶)

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تأثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رشتہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایما وحکم پر رام پور کے ایک

باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی امنگ اور جوشِ مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

''میں اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔''(۱۷)

میں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی خادمہ کا غلام ہوں: شیخ الہندؒ

اسی طرح اپنے برادر اصغر مولانا محمد طاہر کے متعلق قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی راوی ہیں کہ:

''ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا، نماز کے لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے، میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہٗ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ: وضو کرلو، وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے لیے لوٹا لائے، اس پر فرمایا کہ: تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں۔ (پیرو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں خادمہ تھیں)۔ (۱۸)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: بہ صد گریہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ کے جوتے سر پر رکھنا

پے بہ پے خدمت، عظمت و تعلق اور اس خادمانہ پاس ولحاظ کے باوصف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اس بات پر نادم اور شرمندہ رہے کہ انہوں نے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات کا حق ادا نہیں فرمایا۔ چنانچہ سفر حجاز کے لیے روانہ ہوتے وقت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر حاضر ہوئے، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ کی خدمت میں عرض کیا:

''اماں جی! آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جا رہا ہوں، ذرا اپنا جوتہ دے دیجیے، انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھا دیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمادیجیے''۔ (۱۹)

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان سے اصرار: کہہ دو! یہ ناکارہ ہمارا خادم ہی رہا

چلیے! یہ تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ تھیں، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ماں کے مثل تھیں، ان کے رو بہ رو یہ عاجزی اور ندامت قابل فہم بھی ہے، لیکن مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعودؒ کے بالمقابل بھی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

کی عاجزی اور ندامت کا یہی عالم تھا۔ جب کہ حافظ صاحبؒ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور حکیم صاحبؒ مرید۔ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ:

''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسمؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا؟ تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا۔''(۲۰)

یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جاودانی بخشی تھی۔ اپنے شاگرد اور مرید کے روبہ رو ہاتھ جوڑ کر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو مقام احسانی کو پاچکا ہو۔ یہ بے نفسی اور فنائیت عظیم مجاہدات اور سینکڑوں کرامات سے بلند اور بیش قیمت ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: جانور سے اُنس

عشق ومحبت کے خمیر سے پروان چڑھنے والے ہی معرفت اور احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے دل میں انسان تو انسان جانور تک کے لیے جذبۂ ترحم بیدار رہتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لیے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہوگیا۔ حضرت جب دارالحدیث درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیل حکم خداوندی میں خود اپنے دست مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے۔''(۲۱)

اور یہ صرف ایک دفعہ ہی کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ مولانا محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق

یہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ وہ جانور خود پالتے، اسے خود چارہ کھلاتے، ایام قربانی جب قریب ہوجاتے تو گھاس میں کمی کردیتے اور بالٹی بھر کر دودھ جلیبی کھلاتے، پھر قربانی سے پہلے اس کے جگہ جگہ مہندی لگاتے اور پھر یوم نحر (۱۰ ذوالحجہ) کو قربان کرکے ’’لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ‘‘ پر عمل کرتے۔‘‘(۲۲)

وعظ اَللہ کے لیے نہ کہ اظہارِ علم کی غرض سے

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں جامع العلوم کان پور میں مدرس تھے، وہاں جلسہ دستار بندی میں شرکت کی درخواست کے لیے اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو دیوبند خط لکھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس صرف ایک کرتا، ایک پاجامہ، ایک ٹوپی اور ایک لنگی تھی۔ آپ کے کپڑے کھدر کے ہوتے، ہاتھ سے دھوئے جاتے اور انہیں استعمال کیا جاتا۔ چوں کہ کان پور میں دیگر مکتب خیال کے علما اور اہل علم سے ملاقات ونشست کا احتمال تھا، اس لیے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو خاص طور پر لکھا:

’’حضرت! میں ایک بات عرض کرتا ہوں، ہے تو حماقت جو میں عرض کرتا ہوں، مگر بڑے چھوٹوں کی بے وقوفی کو بھی برداشت کرلیتے ہیں۔ حضرت! آپ ذرا دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تشریف لاویں..... حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: تمہارے خط کی رعایت کی جائے گی۔‘‘

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ میرے استاذ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے تشریف لانے والے ہیں، جو اتنے کمالات کے جامع ہیں۔ جب ان حضرات کو آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک لنگی کندھے پر تھی اور جو کان پور کے علماء تھے وہ بڑے بڑے جبے پہنے ہوئے تھے، یہاں ان کو کوئی صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا کہ یہ کوئی چار حرف بھی جانتے ہوں گے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ وتقریر کی درخواست کی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’میں اور وعظ! کیا تمہاری بھد نہیں ہوگی کہ ایسے کے شاگرد ہیں، جن کو بولنا بھی نہیں آتا۔ تمہارا وعظ تو، ماشاء اللہ! وعظ ہوتا ہے‘‘۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا: نہیں! نہیں! آپ وعظ فرمائیں، فرمایا:

’’اچھی بات ہے، وعظ کہوں گا، تاکہ سامعین کو معلوم ہوجائے کہ شاگرد استاذ سے بڑھا ہوا ہے۔‘‘(۲۳)

وعظ شروع فرمایا، جس میں فقہ کے مسائل خوب بیان فرمائے۔ علمائے کان پور یہ سمجھتے تھے کہ

دیوبند اور سہارن پور کے علماء معقولات نہیں جانتے، فقہ خوب جانتے ہیں۔ اسی اثناء میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ تشریف لے آئے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نفس کشی کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے، جہاں کوئی ایسا موقع آیا جس سے نفس کو حظ اٹھانے کا موقع ملے یا کوئی ایسی بات ہو جس سے اپنی بڑائی یا عظمت جھلکتی ہو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت نفس کشی کا سامان مہیا کر لیتے تھے، ان کی ذات وقتی تأثرات وجذبات سے بالکل غیر متأثر اور لاتعلق ہو چکی تھی۔ مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی آمد اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی للّٰہیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے، میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا۔ فرمایا: ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہارِ علم کے لیے بیان ہوا، نہ کہ اللہ کے واسطے۔''(۲۴)

ترجمۂ قرآن کی اشاعت کے لیے تلامذہ کی تصدیق، بے مثل عاجزی

مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ تو پھر معاصر، ذی علم اور صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کے روبہ رو تواضع کا اختیار کرنا اتنا حیران کن نہیں جتنا اپنے تلامذہ کے سامنے تواضع کا واقعتی اظہار موجبِ حیرت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

> ''جب حضرتؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ پورا کیا، تو حضرتؒ نے دیو بند میں سب علماء کو جمع کر کے- جو حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے- یہ فرمایا کہ: بھائی! میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے، لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو، اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے۔''(۲۵)

بلاشک بے نفسی، للّٰہیت اور تقویٰ کا یہ مقام عارفین کو بھی بہت آخر میں جا کر نصیب ہوتا ہے اور اس کا حصول انسان کو ہر ہر لمحہ اپنے احتساب اور محاسبے میں مشغول اور متوجہ رکھتا ہے۔

شیخ الہندؒ: انگریزوں کے متعلق استفتا کا جواب لکھنے سے اعراض، نفرت کلیدی وجہ

ایسے متقی اور باصفا انسان کا کوئی کام جذبات یا غصے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انگریز

جس سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نفرت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، تحریکِ خلافت کے دوران جب ترکِ موالات کے بارے میں حضرتؒ سے استفتا کیا گیا تو اپنے محبوب ترین شاگردوں (مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کو بلا کر فرمایا:

''بھائی! یہ استفتا آیا ہے، میں چاہتا ہوں اس کا جواب آپ لکھ دیں، کیوں کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ: ''وَ لَایَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔'' (اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقویٰ کے قریب تر ہے) اور مجھے انگریزوں سے جس درجے عداوت وبغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے، کہیں میں ان کے بارے میں خلافِ انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔''(۲۶)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: تکفیرِ مسلم سے احتراز کا نمونہ

جو انسان اپنے بدترین دشمن کے متعلق حکم لگانے میں اس درجے محتاط ہو وہ حلقۂ یاراں کے لیے کیوں ریشم کی طرح نرم نہ ہوگا۔ اسی احتیاط کی ایک مثال دیکھیے! مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، اہل بدعت نے اس کا جورَ دلکھا، اس میں انہیں کافر قرار دیا، اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغ را جزا باشد دروغے

ترجمہ: ''تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیوں کہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔''

انہوں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر سنائے تو آپؒ نے شعر کی لطافت کی تعریف فرمائی، لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم نے لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا، حالاں کہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں، اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دروغے

اگر تو مومنی فبہا والا
دروغے را جزا باشد دروغے (۲۷)

ترجمہ: ’’تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلانہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر، ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔‘‘

حوالہ جات

۱:......اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۰ھ، جلد:۳، صفحہ:۱۲۷، ملفوظ:۱۹۳۔

۲:......سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، المعجم الأوسط، قاہرہ، دار الحرمین، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، باب المیم، من اسمہ محمد، محمد بن عثمان بن أبی شیبۃ، جلد:۵، صفحہ:۳۵۶، رقم:۵۵۴۱۔

۳:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ:۱۵۰۔

۴:......حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، لاہور، مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء، صفحہ:۱۵۹۔

۵:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ:۱۶۸۔

۶:......حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، صفحہ:۱۵۹۔

۷:......قاری محمد طیبؒ، ’’پچاس مثالی شخصیات‘‘، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام (مرتب: محمد عمران قاسمی بگیانوی)، مردان، مکتبۃ الاحرار، ۲۰۱۱ء، جلد:۷، صفحہ:۴۲۲۔

۸:......ایضاً، صفحات:۴۲۲-۴۲۳۔

۹:......ایضاً، صفحہ:۴۲۳۔

۱۰:......ایضاً، صفحہ:۴۲۴-۴۲۵۔

۱۱:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد:۱، صفحات:۱۰۶-۱۰۷، قسط اوّل۔

۱۲:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنور، زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ:۲۰۲۔

۱۳:......قاری محمد طیبؒ، ’’پچاس مثالی شخصیات‘‘، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد:۷، صفحات:۴۲۶-۴۲۷۔

۱۴:......ایضاً، صفحہ:۴۳۹۔

۱۵:......ایضاً، صفحہ:۴۳۹-۴۴۰۔

۱۶:......ایضاً، صفحہ:۴۲۱-۴۲۲۔

۱۷:......ایضاً، صفحہ:۴۲۶۔

۱۸:......محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، صفحہ:۹۵۴۔

۱۹:......ایضاً۔

۲۰:......قاری محمد طیبؒ، ’’پچاس مثالی شخصیات‘‘، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد:۷، صفحہ:۴۴۰۔

۲۱:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات:۱۶۸-۱۶۹۔

۲۲:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد:۱، صفحات:۱۰۵-۱۰۶، قسط:۴۔

۲۳:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد:۱، صفحات:۴۲-۴۳، قسط:۵۔

۲۴:......اشرف علی تھانویؒ، ’’ذکر محمودؒ‘‘، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ، صفحہ:۵۳۰۔

۲۵:......محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، جلد:۲، صفحہ:۹۵۰۔

۲۶:......قاری محمد طیبؒ، ’’پچاس مثالی شخصیات‘‘، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد:۷، صفحات:۴۲۷-۴۲۸۔

۲۷:......محمد تقی عثمانی، اکابر دیوبند کیا تھے؟، کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۳ء، صفحہ:۲۳۔

(جاری ہے)

www.banuri.edu.pk

تحقیقِ مخطوطات کا بہترین منہج

ترجمہ: ''المنهج الأمثل لتحقيق المخطوطات''

مترجم: مولانا محمد یاسر عبداللہ

''ڈاکٹر حاتم صالح ضامن ماضی قریب میں عالم اسلام کے معروف محقق ومصنف، علوم قرآن وقراءت سے وابستگی رکھنے والے لائق وفائق اسکالر گزرے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں بغداد میں آنکھ کھولنے والے شیخ حاتم ابتدائی متوسط تعلیم حاصل کرنے کے بعد بغداد یونیورسٹی میں داخل ہوئے، وہیں تعلیمی سلسلے جاری رکھتے ہوئے ۱۹۷۳ء میں ماسٹر اور ۱۹۷۷ء میں لغت کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس اثناء میں ۹/سال تدریسی میدان سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۸۰ء میں بحیثیت استاذ بغداد یونیورسٹی سے منسلک ہوئے، ترقی کرتے کرتے ''قسم اللغة العربية'' کے ڈین/مشرف کے کلیدی عہدے تک جا پہنچے، ۱۹۹۰ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہوگئے، لیکن علمی مشاغل جاری رہے اور کئی علمی وتحقیقی اداروں کی رکنیت انہیں تادمِ واپسیں حاصل رہی۔ دبئی کے ''مركز جمعة الماجد للثقافة والتراث'' کے بانی ومبانی شیخ جمعۃ الماجد نے ان کی شہرت سن رکھی تھی، موقع پاکر اپنے ادارے میں آنے کی دعوت دی تو شیخ بھی چلے آئے اور ۲۰۰۵ء تک مرکز اور اس سے ملحق ادارے ''كلية الدراسات العربية الإسلامية'' سے وابستہ رہے۔ ۱۳/ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۳/فروری ۲۰۱۳ء کی شام کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ علمی ترکے میں لگ بھگ ڈیڑھ سو کتب کی تحقیق وتالیف، سینکڑوں علمی مضامین ومقالات اور اشراف میں تیار کروائے ہوئے دسیوں مقالات چھوڑے، جو علمی میدان میں ان کی شناخت وبقا کا باعث اور یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تحقیق، شیخ حاتم صالح کا امتیازی وصف تھا، شیخ نے اس فن کو اپنی کاوشوں سے معیاری اسلوب فراہم کیا ہے، جس نے اس میدان میں عراقی محققین کو ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ شیخ نے اس اسلوب پر محققین کی ایک پوری جماعت تیار کی ہے۔ ''المنهج الأمثل لتحقيق المخطوطات'' کے نام سے اس مقالے میں اختصار کے ساتھ شیخ نے اپنے منہجِ تحقیق کی وضاحت کی ہے، جس سے ان کے اسلوب کے امتیازات وخصوصیات سامنے آتی ہیں۔ تحقیق وتالیف سے وابستہ اُردو دان طبقے کے افادہ کے لیے اس مقالے کو اردو قالب میں ڈھال کر پیش کیا جارہا ہے۔''

الحمدلله رب العالمين، والصلاة والسلام على أشرف خلقه النبي العربي الأمين، وبعد

مخطوطات، امت کے علمی ترکے کا جزء اور اس کے تہذیبی وقومی وجود کی اہم دستاویزات ہیں،

یہی وجہ ہے کہ امت نے مخطوطات کی حفاظت کا اہتمام کیا اور اس سلسلے میں گونا گوں راہیں نکالی ہیں۔ علمی میراث پر ایمان اور باوقار علمی روح کے ساتھ اس کے اِحیا و تحلیل کی کوشش امت پر ایمان کا ایک مظہر ہے، جو امت کے ارادہ وعزم اور اپنے وجود کی قوت پر یقین کی دلیل ہے، اور اعتماد، وحدت، انقلاب اور تعمیر کا محرک ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال اور تحقیق کسی باریک بیں نگاہ کی زیرنگرانی اور موضوعی منہج کے تحت ہو۔

تحقیقِ مخطوطات کے پہلو سے ہم آج جن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں، ہمارے قدیم علماء ان میں بہت سے مسائل کا حل پیش کر چکے ہیں، مثلاً:

نسخوں کا تقابل، اغلاط کی اصلاح، حذف وسقط اور زیادتی واضافے کا حل، ایک جیسے حروف کو ممتاز کرنا، حواشی لکھنا، علاماتِ ترقیم اور رموز واختصارات، مصادر و مآخذ کا ذکر وغیرہ۔ اور اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں ہیں، زمانی ترتیب کے مطابق ان میں سے چند کتب درجِ ذیل ہیں:

۱:... ''المحدث الفاصل بين الراوی والواعی'': حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزیؒ (م:۳۶۰ھ)

۲:... ''تقييد العلم'': احمد بن علی خطیب بغدادیؒ (م:۴۶۳ھ)

۳:... ''الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع'': خطیب بغدادیؒ

۴:... ''الكفاية فی علم الرواية'': خطیب بغدادیؒ

۵:... ''الإلماع إلٰی معرفة أصول الرواية وتقييد السماع'': قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبیؒ (م:۵۴۴ھ)

۶:... ''معرفة أنواع علوم الحديث'': ابن صلاح عثمان بن عبدالرحمٰنؒ (م:۶۴۳ھ)

۷:... ''الاقتراح فی بيان الاصطلاح'': ابن دقیق العیدؒ (م:۷۰۲ھ)

۸:... ''تذكرة السامع والمتكلم فی أدب العالم والمتعلم'': بدرالدین بن جماعۃؒ (م:۷۳۳ھ)

۹:... ''منية المريد فی آداب المفيد والمستفيد'': زین الدین العاملیؒ (م:۹۶۵ھ)

۱۰:... ''الدر النضيد فی أدب المفيد والمستفيد'': بدرالدین غزیؒ (م:۹۸۴ھ)

۱۱:... ''المعيد فی أدب المفيد والمستفيد'': عبدالباسط بن موسیٰ علمویؒ (م۹۸۱) یہ غزیؒ کی سابقہ کتاب کا اختصار ہے۔

۱۲:... ''قواعد التحديث من فنون مصطلح الحديث'': محمد جمال الدین قاسمیؒ (م:۱۳۳۲ھ)

۱۳:... ''توجيه النظر إلٰی أصول الأثر'': طاہر جزائریؒ (م:۱۳۳۸ھ)

(واضح رہے کہ مذکورہ کتب اصلاً تحقیقِ مخطوطات سے متعلق نہیں، بلکہ علوم حدیث کے مختلف پہلوؤں اور آدابِ علم سے بحث کرتی ہیں، البتہ ضمناً ان میں تحقیق کے متعلقہ مباحث بھی آ گئے ہیں [از مترجم])

متاخرین کا دور آیا تو انہوں نے تحقیقِ مخطوطات کے قواعد کے متعلق کتابوں کا ایک معتد بہ مجموعہ ترتیب دیا۔ مستشرقین کو ہمارے علمی ترکے کی نشر واشاعت میں سبقت حاصل ہے، انہوں نے (اپنے تئیں) تحقیقِ مخطوطات کا منہج ترتیب دے کر اسی کے مطابق کام کیا ہے۔ عربوں نے بھی تحقیقِ نصوص کا آغاز کیا تو بہت سی نفیس کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ نیز یونیورسٹیوں کی جانب سے اعلیٰ ڈگریوں کے حصول کے لیے تحقیقِ تراث کا دَر وا ہونے کے بعد تو یہ رجحان زیادہ مضبوط ہوا ہے۔ بغداد یونیورسٹی کے ''کلیة الآداب'' میں ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ''تحقیقِ نصوص'' کا موضوع داخلِ نصاب کرنے کا شرف مجھے حاصل ہے، جو نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے پڑھایا جارہا ہے، اور کوئی فسادی قلب کا مالک ہی اس رجحان کے سامنے روک لگانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ الحمد للہ! ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔

عراقی محققین کے اسلوبِ تحقیق کی خصوصیات

گزشتہ ربع صدی سے متقدمین اور متأخرین علماء کے مناہج سے واقفیت کی روشنی میں' میں کہہ سکتا ہوں کہ دیگر ممالک کی بنسبت ہماری تحقیقات منفرد خصوصیات کی حامل ہیں، جن میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

۱:- تخریج کے مصادر و مآخذ میں زمانی تسلسل کی رعایت

اس لیے کہ متقدمین کو فضیلت حاصل ہے اور متأخرین بھی اخبار میں انہیں پر اعتماد کرتے ہیں۔
ایک معروف محقق کی کتاب نظر سے گزری، جس میں ایک شعر کی یوں تخریج کی گئی تھی:
''خزانة الأدب، الأغاني، طبقات فحول الشعراء۔''
محقق موصوف نے زمانی ترتیب کی رعایت نہیں رکھی تھی، انہیں یوں تخریج کرنی چاہیے تھی:
''طبقات فحول الشعراء، الأغاني، خزانة الأدب۔''

(زمانی تسلسل کا لحاظ اس بنا پر ضروری ہے) کہ ابن سلام کی وفات ۲۳۲ھ میں، ابوالفرج اصفہانی کی ۳۶۲ھ میں اور عبدالقادر بغدادی کا وصال ۱۰۹۳ھ میں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی تحقیقات میں مصادر کا ذکر کرتے ہوئے ہر مصنف کے سنِ وفات کا بالتزام تذکرہ کیا ہے اور اپنے طلبہ پر بھی اُسے لازم قرار دیا ہے۔

۲:- اشعار وارجاز کی تخریج میں محقق مطبوعہ دواوین یا مجموعوں پر اکتفا اور اختلافِ روایت کی صورت میں اس کی طرف اشارہ

واضح بات ہے کہ ان تمام مصادر کا ذکر کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں جن میں وہ شعر آیا ہے، وہ تو بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔

ہمارے بہت سے محقق بھائیوں نے اس نکتے سے اختلاف کیا ہے، لیکن ہم نے اسی انداز کا التزام کیا ہے اور ہم اس سے ہرگز پیچھے نہ ہٹیں گے۔ ہمارے شیخ معتمد محقق محمود محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء) نے ایک نجی خط میں اس منہج کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے ان لوگوں کو ''جاہل محققین'' سے موصوف کیا ہے جو (بلاسبب) زیادہ تخریج کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے رسالے میں مذکور ایک شعر کی طرف اشارہ بھی کیا، جہاں محقق نے ستر کتابوں سے شعر کی تخریج کرڈالی تھی، حالانکہ شیخ نے لکھا ہے کہ: ''والبیت فی دیوانہٖ'' وہ شعر خود شاعر کے دیوان میں موجود ہے۔ اس کتاب اور محقق کا نام ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا مقصود یہ نہیں ہے۔

۳:-تراجم کے لیے قدیم اور مخصوص مصادر کی جانب رجوع

بعض لوگ محض خیرالدین زرکلیؒ (م:۱۹۷۶ء) کی ''الأعــــلام'' یا عمر رضا کحالہؒ (م:۱۴۰۸ھ) کی ''معجم المؤلفین'' کی طرف اشارے پر اکتفا کرلیتے ہیں، سہولت پسند محققین کا یہی منہج ہے۔ ایک اور قسم کے محققین الل ٹپ کبھی ''الأعـلام'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کبھی ''کشف الـظـنــون'' کی جانب، کبھی ''میـــزان الاعتـدال'' کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی ''خــزانة الأدب'' کا، یہ انداز درست نہیں۔

ہمارا منہج جو ہمارے خیال میں منفرد منہج ہے، درج ذیل ہے:

تراجمِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ان کتابوں کی مراجعت جو مستقل طور پر ان کے تراجم کے لیے لکھی گئی ہیں، مثلاً:

۱:...''**معجم الصحابة**'': ابن قانعؒ (م:۳۵۱ھ)
۲:...''**معرفة الصحابة**'': ابونعیم اصفہانیؒ (م:۴۳۰ھ)
۳:...''**الاستيعاب**'': ابن عبدالبرؒ (م:۴۶۳ھ)
۴:...''**أسد الغابة**'': ابن اثیرؒ (م:۶۳۰ھ)
۵:...''**الإصابة**'': ابن حجرؒ (م:۸۵۲ھ)

مفسرین کے حالات کے لیے ان کے تراجم کے ساتھ خاص کتب کی طرف رجوع، مثلاً:

۱:...''**طبقات المفسرين**'': سیوطیؒ (م:۹۱۱ھ)
۲:...''**طبقات المفسرين**'': داؤدیؒ (م:۹۴۵ھ)
۳:...''**طبقات المفسرين**'': (ادنہ ویؒ)

محدثین اور راویانِ حدیث کے تراجم کے لیے ان کے حالات کے ساتھ خاص کتب کی مراجعت، جو الحمدللہ بہت ہیں، بطور مثال بلاحصر ملاحظہ فرمایئے:

۱:... ''التاریخ الکبیر'': امام بخاریؒ (م:۲۵۶ھ)

۲:... ''تهذيب الكمال'': مزیؒ (م:۷۴۲ھ)

۳:... ''تهذيب التهذيب'': ابن حجر عسقلانیؒ (م:۸۵۲ھ)

محدثین میں سے ضعفا کے لیے کتبِ ضعفا کی جانب رجوع، مثلاً:

۱:... ''كتاب الضعفاء'': بخاریؒ (م:۲۵۶ھ)

۲:... ''كتاب الضعفاء'': نسائیؒ (م:۳۰۳ھ)

۳:... ''كتاب الضعفاء'': دار قطنیؒ (م:۳۸۵ھ

۴:... ''كتاب الضعفاء'': ذہبیؒ (م:۷۴۸ھ)

اسی طرح مجروح راویوں سے متعلق کتابیں، جیسے: ''المجروحين'' ابن حبانؒ (م:۳۵۴ھ) وغیرہ۔

مذاہبِ اربعہ کے فقہاء کے حالات کے لیے شافعیہ، حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے طبقات کے ساتھ خاص کتب کی مراجعت، جو بحمد اللہ بہت سی ہیں۔

شیعہ علماء ورجال کے لیے ان کے ساتھ خاص کتابوں کی طرف رجوع، جیسے کشی (م: ۳۴۰ھ)، نجاشی (م:۴۵۰ھ) اور طوسی (م:۴۶۰ھ) کی شیعہ رجال کے متعلق کتابیں، اور ''روضات الجنات'' خوانساری (م:۱۳۱۳ھ)

قراء کے تراجم کے لیے ان کے متعلق کتب کی مراجعت، مثلاً:

۱:... ''معرفة القراء الكبار'': ذہبیؒ (م:۷۴۸ھ)

۲:... ''غاية النهاية في طبقات القراء'': ابن جزریؒ (م:۸۳۳ھ) جو اس باب میں سب سے وسیع تر کتاب ہے اور بہت سے قراء کے تراجم میں منفرد ہے۔

اہلِ تصوف کے حالات کے لیے طبقات الصوفیۃ سے متعلق کتابوں کی طرف رجوع، جیسے:

۱:... ''طبقات الصوفية'': سلمیؒ (م:۴۱۲ھ)

۲:... ''طبقات الصوفية'': ابن ملقنؒ (م:۸۰۴ھ)

۳:... ''لواقح الأنوار في طبقات الأخيار'': شعرانیؒ (م:۹۷۳ھ)

نحویوں اور لغویوں کے تراجم کے لیے ان کے حالات کے ساتھ خاص کتب کی مراجعت، جیسے:

۱:... ''مراتب النحويين'': ابوطیب لغویؒ (م:۳۵۱ھ)

۲:... ''أخبار النحويين البصريين'': سیرافیؒ (م:۳۶۸ھ)

۳:... ''طبقات النحويين واللغويين'': ابوبکر زُبیدیؒ (م:۳۷۹ھ)

۴:...''انباہ الرواۃ علیٰ أنباء النحاۃ'': قفطیؒ (م:۶۴۶ھ)

۵:...''بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ'': سیوطیؒ (م:۹۱۱ھ)

شعراء کے تراجم کے لیے ان کے حالات پر لکھی گئی کتب کی جانب رجوع، جیسے:

۱:...''طبقات فحول الشعراء'': ابن سلاّم (م:۲۳۱ھ)

۲:...''طبقات الشعراء المحدثین'': ابن معتز (م:۲۹۶ھ)

۳:...''المؤتلف والمختلف'': آمدی (م:۳۷۰ھ)

۴:...''معجم الشعراء'': مرزبانی (م:۳۸۴ھ)

۵:...''الأغانی'': ابوالفرج اصفہانی (م بعد:۳۶۰ھ)

نسب، کنیت اور لقب کی تحقیق کے لیے کتبِ انساب وکُنی والقاب کی مراجعت، مثلاً:

۱:...''المؤتلف والمختلف'': ابن حبیب (م:۲۴۵ھ)

۲:...''الکنی والاسماء'': دُولابی (م:۳۱۰ھ)

۳:...''جمہرۃ أنساب العرب'': ابن حزم (م:۴۵۴ھ)

۴:...''الإکمال'': ابن ماکولا (م:۴۸۶ھ)

۵:...''الأنساب'': سمعانی (م:۵۶۲ھ) وغیرہ۔

۴:- زیرِ تحقیق کتاب میں کسی مقام کے ضبط یا معنی کے سمجھنے کے لیے اس پہلو سے خاص کتب کی طرف رجوع

چنانچہ کسی مشکل کلمہ کے معنی کے لیے معاجم عربیہ کی جانب مراجعت، جو بحمد اللہ بہت ہیں اور ہر طالب علم پر ان کے مناہج کی پہچان لازم ہے، ان میں سے بعض خلیل بن احمد (م:۱۷۵ھ) کی ''العین'' کی ترتیب کے مطابق ہیں، بعض جوہری (م:۳۹۳ھ) کی ''الصحاح'' کے منہج کے موافق ہیں، بعض زمخشری (م:۵۳۸ھ) کی ''أساس البلاغۃ'' کے طرز پر ہیں اور بعض منفرد انداز کی حامل ہیں، جیسے: ابنِ دُرید (م:۳۲۱ھ) کی ''جمہرۃ اللغۃ''، ابن فارس (م:۳۹۵ھ) کی ''المجمل'' اور ''مقاییس اللغۃ''۔

قراءات کی معرفت کے لیے کتبِ قراءات کی مراجعت

محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ قراءاتِ سبعہ، قراءاتِ عشرہ اور قراءاتِ اربع عشرہ سے واقف ہو، اور اسے شاذ قراءتوں کی معرفت بھی حاصل ہو، تاکہ قراءات کے ساتھ خاص کتب کی طرف رجوع کر سکے، جیسے:

ا:...''شواذ القراءات'': ابن خالویہ (م: ۳۷۰ھ)

۲:...''المحتسب'': ابن جنی (م: ۳۹۲ھ)

۳:...''شواذ القراءات'': کرمانی (م بعد: ۵۶۳ھ)

۴:...''إعراب القراءات الشواذ'': عُکبری (م: ۶۱۶ھ)

قرآنِ کریم کے کسی کلمہ کی وجوہ کی پہچان کے لیے ''کتبُ الوجوہ والنظائر فی القرآن الکریم'' کی جانب رجوع کیا جائے، مثلاً: مقاتل بن سلیمان اور ہارون بن موسیٰ قاری (م ق: ۱۷۰ھ) کی کتابیں، یحییٰ بن سلام (م: ۲۰۰ھ) کی ''التصاریف''، اور ابن جوزی (م: ۵۹۷ھ) کی کتاب۔

قرآن کریم کے مشکل الفاظ کی معرفت کے لیے ''کتبِ غریب القرآن'' کی مراجعت کی جائے، مثلاً: یزیدی (م: ۲۳۷ھ)، ابن قتیبہ (م: ۲۷۶ھ)، ابن عزیز سجستانی (م: ۳۳۰ھ) اور راغب اصفہانی (م: ۴۵۰ھ) کی کتب۔

قرآن کے کسی کلمہ کے اعراب کے لیے ''کتبِ اعراب القرآن'' کی جانب رجوع کیا جائے، جیسے: نحاس (م: ۳۳۸ھ)، ابنِ خالویہ (م: ۳۷۰ھ)، مکی قیسی (م: ۴۳۷ھ)، عُکبری (م: ۶۱۶ھ)، منتجب ہمذانی (م: ۶۴۳ھ) اور سمین حلبی (م: ۷۵۶ھ) کی کتابیں۔

حدیث کی معرفت کے لیے کتبِ حدیث کی مراجعت کی جائے، مثلاً: سب سے پہلے ''صحیح البخاری'' (م: ۲۵۶ھ)، پھر ''صحیح مسلم'' (م: ۲۵۱ھ)، پھر امام ابن ماجہؒ (م: ۲۷۵ھ)، امام ابوداوٗدؒ (م: ۲۷۵ھ)، امام ترمذیؒ (م: ۲۷۹ھ) اور امام نسائیؒ (م: ۳۰۳ھ) کی ''کتبُ السنن''، اور دیگر کتبِ حدیث: ''موطا امام مالک'' (م: ۱۷۹ھ) اور ''مسند أحمد بن حنبل'' (م: ۲۴۱ھ) وغیرہ۔

البتہ موضوع احادیث کے لیے جداگانہ مستقل کتابیں ہیں، مثلاً:

ا:...''الموضوعات'': ابن جوزیؒ (م: ۵۹۷ھ)، ۲:...''اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة'': سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ)، ۳:...''الفوائد المجموعة فی الأحادیث الموضوعة'' شوکانیؒ (م: ۱۲۵۰ھ)

احادیث وآثار کے کسی غریب کلمہ کی تحقیق کے لیے ''کتبِ غریبُ الحدیث'' کی طرف رجوع کیا جائے، جیسے: ابوعبیدؒ (م: ۲۲۴ھ)، ابن قتیبہؒ (م: ۲۷۶ھ)، حربیؒ (م: ۲۸۵ھ) اور خطابیؒ (م: ۳۸۸ھ) کی کتابیں، زمخشری (م: ۵۳۸ھ) کی ''الفائق'' اور ابن اثیر (م: ۶۰۶ھ) کی ''النہایة فی غریب الحدیث والأثر''۔

نباتات کے متعلق کسی کلمے کی معرفت کے لیے کتبِ نباتات کو دیکھا جائے، مثلاً: اصمعی (م: ۲۱۶ھ) اور ابن قتیبہ دینوری (م: ۲۸۲ھ) کی کتابیں۔

اضداد میں سے کسی کلمہ کی پہچان کے لیے کتبِ اضداد کی مراجعت کی جائے جو دس کے قریب ہیں اور ان میں قدیم تر قطرب (م: ۲۱۰ھ) کی کتاب ہے۔

مشترک لفظی کلمات کی تحقیق کے لیے اس باب کی کتب دیکھی جائیں، جیسے: ''ما اتفق لفظهٗ واختلف معناه'' کے نام سے یزیدی (م: ۲۲۵ھ)، ابوعُمَیثل (م: ۲۴۰ھ) اور ابن شَجَری (م: ۵۴۲ھ) کی کتابیں۔

مترادف الفاظ کی تحقیق کے لیے اس قبیل کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے، جیسے: ''ما اختلفت ألفاظهٗ واتفقت معانيه'' کے نام سے اصمعی (م: ۲۱۶ھ)، ابن سِکیت (م: ۲۴۴ھ)، ہمذانی (م: ۳۲۰ھ)، قدامہ بن جعفر (م: ۳۳۷ھ) اور رُمانی (م: ۳۸۴ھ) کی کتابیں۔

کلماتِ ضادیہ یا ظائیہ کی معرفت کے لیے اس باب کی کتب کی مراجعت کی جائے، جو الحمد للہ بہت ہیں، ''کتب الضاد والظاء'' کے سلسلے کی تیرہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

مذکر اور مؤنث کلمات کی پہچان کے لیے اس باب کی کتابیں دیکھی جائیں، ان میں سے تقریباً دس کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں سے قدیم تر فراء (م: ۲۰۷ھ) کی کتاب ہے۔

مقصور وممدود الفاظ کی تحقیق کے لیے اس قبیل کی کتب کی طرف رجوع کیا جائے، جو ابن دُرید (م: ۳۲۱ھ) اور ابن مالک (م: ۶۷۲ھ) کے منظومات کے علاوہ بھی اُنیس ہیں۔

مثلثِ لغوی کلموں کی معرفت کے لیے اس بارے میں لکھی گئی کتابیں دیکھی جائیں، جو منظومات کے علاوہ سات ہیں، قدیم تر کتاب قطرب (م: ۲۱۰ھ) کی ہے۔

مثنیٰ کلمے کی پہچان کے لیے اس موضوع کی دو مطبوعہ کتابوں کی مراجعت کی جائے: ''المثنى'' ابوطیب لغوی (مص ۳۵۱ھ) اور ''جنى الجنتين في تمييز المثنتين'' محبی (م: ۱۱۱۱ھ)

ایسے کلمات جن میں عوام غلطی کر جاتے ہیں، ان کی تحقیق کے لیے ''لحن العامة'' یعنی لغوی تصحیحات پر لکھی گئی کتب کی جانب رجوع کیا جائے، جن میں سے قدیم تر کسائی (م: ۱۸۹ھ) کی کتاب ہے، اور کل نو کتب طبع ہو چکی ہیں۔

مصحف ومحرف کلمہ کی تحقیق کے لیے کتبِ تصحیف وتحریف دیکھی جائیں، مثلاً: ''التنبيه على حدوث التصحيف'' حمزہ اصبہانی (م: ۳۶۰ھ)، ''التنبيه على أغاليط الرواة'' علی بن حمزہ بصری (م: ۳۷۵ھ) اور ''شرح مايقع فيه التصحيف والتحريف'' ابواحمد عسکری (م: ۳۸۲ھ)۔

معرب کلمے کی پہچان کے لیے اس باب کی کتب کی مراجعت کی جائے، جیسے: ''المعرب'' جوالیقی (م: ۵۴۰ھ)، ''شفاء الغليل فيما في كلام العرب من الدخيل'' شہاب الدین خفاجی (م: ۱۰۶۹ھ)

www.banuri.edu.pk

اور ''قصد السبیل فیما فی العربیة من الدخیل'' محبی (م:۱۱۱۱ھ)۔

انسان کی خلقت سے متعلق کسی بات کی معرفت کے لیے اس نوع کی کتابیں دیکھی جائیں، مثلاً: اصمعی (م:۲۱۶ھ)، زجاج (م:۳۱۱ھ)، ثابت بن ابی ثابت اور اسکافی (م:۴۲۰ھ) کی کتب۔

ازمنہ اور انواء کی پہچان کے لیے اس باب کی کتب کی طرف رجوع کیا جائے، جیسے: فراء (م:۲۰۷ھ)، قطرب (م بعد: ۲۱۰ھ)، ابن قتیبہ (م:۲۷۶ھ)، مرزوقی (م:۴۳۲۱ھ) اور ابن اجدابی (م قبل: ۴۷۰ھ) کی کتابیں۔

کسی جگہ کی تعیین یا کسی شہر کے نام کی تحقیق کے لیے درجِ ذیل کتابیں دیکھی جائیں: ''معجم مااستعجم'' بَکری (م::۴۸۷ھ)، ''الأماکن'' حازمی (م:۵۸۴ھ)، ''معجم البلدان'' یاقوت (م:۶۲۶ھ) اور ''الروض المعطار'' حمیری (م:۷۲۷ھ)۔

کسی ضرب المثل کی معرفت کے لیے کتبِ امثال کی طرف رجوع کیا جائے، میری معلومات کے مطابق اس موضوع پر سترہ کتابیں ہیں، قدیم تر کتاب مفضل ضبی (م قبل: ۱۷۸ھ) کی ہے۔

کسی نحوی مسئلے کی تحقیق کے لیے کتبِ نحو کی مراجعت کی جائے، جو الحمدللہ بہت ہیں۔

نحو کے کسی اختلافی مسئلے کے لیے اس موضوع میں تالیف کی گئی کتب دیکھی جائیں، جیسے: ''الانصاف فی مسائل الخلاف'' ابوبرکات انباری (م:۵۷۷ھ)، ''التبیین عن مذاهب النحویین البصریین والکوفیین'' عکبری (م:۶۱۶ھ) اور ''ائتلاف النصرة فی اختلاف نحاة الکوفة والبصرة'' شرجی زَبیدی (م:۸۰۲ھ)۔

فنونِ بلاغت میں سے کسی فن کی معرفت کے لیے کتبِ بلاغت کی جانب رجوع کیا جائے، جو بحمداللہ بہت ہیں۔

اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے کی پہچان کے لیے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی مراجعت کی جائے، مثلاً: ''الفَرق بین الفِرَق'' عبدالقاہر بغدادی (م:۴۲۹ھ)، ''الفِصل فی المِلل والأهواء والنِحل'' ابن حزم اندلسی (م:۴۵۶ھ) اور ''المِلل والنِحل'' شہرستانی (م:۵۴۸ھ)۔

۵:- اقوال کی تخریج ان کے قائلین کی کتابوں سے ہو اگر وہ مطبوع ہوں، اور اگر وہ کتب ہم تک نہ پہنچی ہوں تو دیگر مصادر سے ان کی توثیق

اقوال اور نصوص کی ان کے قائلین کی کتب سے تخریج کو اہمیت دینے سے محقق کو عبارت کی توثیق اور ضبط میں مدد ملتی ہے، بطورِ مثال میں کہتا ہوں:

نیسان (جولائی) ۱۹۷۳ء میں، میں نے دس نسخوں کو سامنے رکھ کر مکی بن ابو طالب (م:

۴۳۷ھ) کی کتاب ''مشکل إعراب القرآن'' کی تحقیق مکمل کی، اس کتاب میں خلیل (م: ۱۷۵ھ)، سیبویہ (م: ۱۸۰ھ)، فراء (م: ۲۰۷ھ) اور مبرد (م: ۲۸۵ھ) کی کتب سے عبارات منقول ہیں، میں نے ان سب عبارتوں کی تخریج کی، حالانکہ سیبویہ کی کتاب سے ان کے اور خلیل کے اقوال کی تخریج میں مجھے بہت مشقت جھیلنی پڑی، اس لیے کہ شیخ عُضیمہؒ کی فہرست ۱۹۷۵ء میں چھپی ہے، اسی طرح سیبویہ کی ''الکتاب'' پر عبدالسلام ہارون (م: ۱۴۰۸ھ) کی فہرست بھی ۱۹۷۷ھ میں طبع ہوئی ہے۔ ان نقول کے تقابل کے دوران مکی کی کتاب میں کافی اضطراب ملا، وہ کبھی خلیل کے قول کو سیبویہ کی طرف اور کبھی سیبویہ کے قول کو خلیل کی جانب منسوب کردیتے ہیں۔ میں نے تحقیق کے دوران حواشی میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ڈیڑھ سال بعد دمشق سے ''مشکل إعرب القرآن'' چھپ کر سامنے آئی، کسی محقق نے اس کی اشاعت میں جلد بازی سے کام لیا تھا، چنانچہ موصوف نے سیبویہ اور خلیل کے چھیالیس اقوال کو یونہی (بلاتحقیق) چھوڑ دیا، حالانکہ وہ سیبویہ کی کتاب میں موجود ہیں، بنا بریں اضطراب یونہی بلااشارہ قائم رہا، اس لیے کہ خود محقق کو اس کا ادراک ہی نہ تھا۔ علمی تحقیق میں یہ چیز خلل کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح محقق نے مبرد کے ایسے چودہ اقوال کو بھی بلاتخریج چھوڑ دیا تھا جو ان کی کتاب ''المقتضب'' میں موجود ہیں، اسی طرح فراء کے چار اقوال کی تخریج بھی نہیں کی تھی حالانکہ وہ ان کی کتاب ''معانی القرآن'' میں مذکور ہیں۔ ایک بااعتماد محقق جو اپنا کام عمدگی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہو، اس کے لیے اقوال کی تخریج میں صبر سے کام لینا نہایت ضروری ہے۔

۶:-حواشی کو بوجھل نہ کرنا اور عبارت کو درست صورت میں ضبط کرکے سامنے لانا

اپنے سے پہلی نسل کی تحقیقات سے واقفیت ہوئی تو عجیب وغریب چیزیں دکھائی دیں۔ ایک طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات دو صفحوں میں ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تین صفحوں میں، مزید اسی پر قیاس کر لیجیے، اور ادھر کچھ شعراء کے حالات کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جن میں محقق' شاعر کی شخصیت، اس کے اشعار کے فنون اور مثالوں سے بحث کررہا ہے۔ نیز موجودہ مطبوعہ کتب کے حواشی میں ایسی بہت سی عبارات ہیں جو دیگر طبع شدہ کتابوں سے نقل کی گئی ہیں، یہ بلاضرورت حواشی کو بوجھل بنانا ہے۔ تحقیق' کتاب کی شرح کا نام نہیں، بلکہ ہمیں اختصار کے ساتھ توثیق وتخریج، صحیح شکل میں عبارت کے ضبط، اور مؤلف کے مطابق سالم صورت میں نص کو سامنے لانے کی ضرورت ہے، ساتھ ساتھ محض التباس کا احتمال رکھنے والے الفاظ کی شرح ہو۔

۷:-تخریج اور حوالہ جات میں علمی تحقیق کے ساتھ طبع شدہ کتب پر اعتماد اور دیگر طبعات سے بے اعتنائی

بے شمار کتابیں بلاتحقیق چھاپ دی جاتی ہیں اور ان میں بہت سی تصحیفات اور تحریفات رہ جاتی ہیں، لیکن جب وہی کتابیں علمی تحقیق کے ساتھ طبع ہوجائیں تو پھر (دورانِ تحقیق وتخریج) انہی پر اعتماد ضروری ہے اور محقق کے لیے تحقیق شدہ ایڈیشنوں کے حاصل نہ ہونے کا بہانہ کوئی دلیل نہیں، لہٰذا شیخ محمود محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء) کی تحقیق کے ساتھ عبدالقاہر جرجانی (م:۴۷۱یا۴۷۴ھ) کی ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة'' منظرِ عام پر آنے کے بعد علمی پہلو سے ان دونوں کتابوں کے سابقہ ایڈیشن ناقابلِ اعتبار ٹھہرتے ہیں۔ اسی طرح قزاز (م:۴۱۲ھ) کی کتاب ''مایجوز للشاعر فی الضرورة'' دوبار پہلے تیونس میں اور پھر اسکندریہ میں طبع ہوئی ہے، لیکن قاہرہ سے جو تیسرا طبع آیا تو اس نے پہلے دو کو گرادیا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہمارے ہاں اگر طالبِ علم علمی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ طبعات پر اعتماد نہ کرے تو اس سے باز پرس کی جاتی ہے۔

۸:-علمی دیانت اور نص کا احترام

یہ ایک اہم قضیہ ہے جس کی بنا پر ہم بہت مشقت اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں ایسی تحقیقات سے سابقہ پڑتا ہے، جن کے ناشرین نے قلم کی باگ چھوڑ رکھی ہے، وہ نص میں من مانا تصرف کرتے ہوئے جیسے چاہیں تقدیم وتاخیر اور اضافہ وحذف کرتے ہیں۔ بعض تو اس حد تک تجاوز کرگئے ہیں کہ نہایت بودے دلائل کو بنیاد بنا کر کتاب کا نام ہی بدل ڈالا، پھر اسی کتاب کو دوسرے نام سے چھاپ دیا۔ میں ایسے ناشر کو محقق نہیں کہتا، یہ علم کی بجائے تجارتی نفع کا خواہشمند ہے، تحقیق سے اسے کوئی سروکار نہیں، فإلی اللہ المشتکیٰ!

مثلاً: دامغانی (م:۴۷۸ھ) کی کتاب ''الوجوہ والنظائر فی القرآن الکریم'' کو عبدالعزیز سید الاہل نے چھاپا ہے، جس میں بہت سے ایسے اضافات ہیں جو اصل کتاب میں نہیں، مؤلف کی ترتیب کو بدل کر کتاب کا نام ''إصلاح الوجوہ والنظائر فی القرآن الکریم'' رکھ دیا ہے، چہ جائے کہ اس کی نسبت میں وہم ہو، یہ ایک ناقابلِ اعتبار طبع ہے جسے وقعت نہیں دی جاسکتی۔

شیخ عرفان بن سلیم عشا حسونہ نے ''تهذيب معانی القرآن وإعرابه'' چھاپی اور مقدمے میں لکھا: ''مجھے خیال آیا کہ میں اس کتاب سے زجاج کی ذکر کی گئی چیزیں حذف کردوں، تاکہ کتاب عیب دار عبارات سے خالی ہوجائے''۔ سبحان اللہ! کیا کہنے! یہ ناشر صاحب زجاج کی ترتیب پر معترض ہیں اور اس میں تبدیلی وحذف اس لیے چاہتے ہیں کہ اس کے دل میں یہ ''خیال'' آیا ہے، انہیں کیا خبر کہ علمی دیانت اور تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ کتاب کو مصنف کی ترتیب کے مطابق جوں کا توں پیش کیا جائے۔

ایک اور عجیب وغریب مثال ملاحظہ ہو: کرمانی (م: ۵۰۵ھ) کی کتاب ''**البرهان فی متشابه القرآن لما فيه من الحجة والبيان**'' کو عبدالقادر احمد عطا نے تین بار نہایت گھٹیا انداز میں چھاپا ہے، پہلی بار اس کا نام ''**أسرار التكرار فی القرآن**'' تھا، اور ناشر کا کہنا تھا کہ سہولت کی بنا پر اس نام کی جانب اس کا میلان ہوا ہے اور اس نے مؤلف کا رکھا ہوا نام اس لیے ترک کردیا ہے کہ لوگ متشابہ کے معنی سے ناواقف ہیں، یہ طبع تیونس کا تھا، پھر انہی عیوب کے ساتھ دوبارہ ''**البرهان فی توجيه متشابه القرآن لمافيه من الحجة والبيان**'' کے نام سے دوسرا ایڈیشن شائع کیا، اور مؤلف کے رکھے ہوئے نام میں لفظِ ''**توجيه**'' کا اضافہ کیا، یہ بیروتی طبع تھا۔ تیسری بار مصر میں چھاپا تو ٹائٹل پر عنوان یوں تھا: ''**أسرار التكرار فی القرآن المسمى البرهان فی توجيه متشابه القرآن لما فيه من الحجة والبيان**''۔ بخدا! یہ علم نہیں تجارت ہے اور اس غلط بیان ناشر نے اسی انداز سے کئی اور کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اللہ اس سے درگزر کرے، اس نے علم اور اہلِ علم کے ساتھ برا سلوک کیا۔

بہرکیف، یہ ایک مشکل منہج ہے جس میں محقق کو بہت سے مصادر کی جانب مراجعت کرنا پڑتی ہے، جو بعض اوقات اس کی دسترس میں بھی نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم میں اسی منہج کا پابند کیا ہے، تاکہ وہ تحقیق پر قادر اور ہر باب کے مصادر سے آگاہ ہوکر نکلیں، وہ وسیع آفاق کے حامل ہوں، علمی ترکے میں جدید کی اتباع کریں، ان کے اور جدیدیات کے درمیان اس ربط سے تحقیق کی پختگی اور اس پر قدرت میں گہرا اثر ہوتا ہے۔

تحقیق کوئی آسان کام نہیں، جیسے نادان لوگ اس کا تصور پیش کرتے ہیں، بلکہ یہ ایک مشکل اور تھکا دینے والا عمل ہے، اپنی قابلِ قدر علمی میراث کے احیاء کی حرص ہی ہے جس نے ہمیں ان مشکلات پر غالب کررکھا ہے۔ **فالحمدلله الذی هدانا لهذا، و ماكنا لنهتدی لو لا أن هدانا الله!**

ہمارے نزدیک یہ ایک بہترین منہج ہے، جس میں ہم نے بہت سی صعوبتوں کا سامنا کیا، بہتیرے دشمن مقابلے میں آئے، لیکن الحمدللہ! تیس سال کے طویل عرصے سے ہم اسے پھیلانے میں کامیاب ہیں اور صرف عراق میں ہی نہیں، بلکہ تیونس میں اور الجزائر میں جہاں باتنہ، قسنطینہ اور عاصمہ میں تین ادارے کھل چکے ہیں اور ان کا نگران (سلف کے) علمی ترکے کا شیدائی ہمارا ہی ایک طالب علم ہے۔ آج ہم اس پرامن شہر میں ہیں جس کے باسی خوش وخرم ہیں۔ امید ہے کہ ہم اپنے طلبہ وطالبات کو اس میراث کے احیاء کے لیے تیار کرنے میں کامیاب رہیں گے، جو ہماری گردنوں پر ایک امانت ہے۔ **والله الموفق!**

کسبِ معاش اور اسلامی نقطۂ نظر

مفتی محمد راشد ڈَسکوی

موجودہ دور میں ایک دین دار طبقہ کم عقلی اور بے علمی کی وجہ سے یہ ذہن رکھتا ہے کہ محنت کرنے اور کمانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تو رزق دینے میں ہماری محنت کے محتاج نہیں ہیں، وہ ایسے بھی دینے پر قادر ہیں، لہٰذا ہمیں کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم تو اعمال کے ذریعے اللہ سے لیں گے، اسباب کے ذریعے نہیں۔

تو اس بارے میں اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ایک ہے اسباب کا اختیار کرنا اور انہیں استعمال کرنا، اور ایک ہے ان اسباب کو دل میں اتارنا اور ان پر یقین رکھنا، پہلی چیز کو اپنانا محمود اور مطلوب ہے اور دوسری چیز کو اپنانا مذموم ہے۔ ہماری محنت کا رُخ یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان اسباب کی محبت اور یقین دل سے نکالیں اور اس کے برعکس یقین اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ ہماری ہر طرح کی ضروریات پوری کرنے والی ذات‘ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ چاہے تو اسباب کے ذریعے ہماری حاجات وضروریات پوری کردے اور چاہے تو ان اسباب کے بغیر محض اپنی قدرت سے ہماری ضروریات وحاجات پوری کردے، وہ اس پر پوری طرح قادر اور خود مختار ہے۔ البتہ! ہم اس دارالاسباب میں اسباب اختیار کرنے کے پابند ہیں، تاکہ بوقتِ حاجت وضرورت ہماری نگاہ وتوجہ غیر اللہ کی طرف نہ اُٹھ جائے۔

اس بات میں تو کوئی شک وشبہ ہے ہی نہیں کہ اللہ رب العزت ہماری محنتوں کے محتاج نہیں ہیں، لیکن کیا شریعت کا مزاج اور منشأ بھی یہی ہے؟! کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، بالخصوص جب، اس ترکِ اسباب کا نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق تلف ہوتے ہوں اور یہ غیروں کے اموال کی طرف حرص وہوس کے ساتھ دیکھتا رہے، تو یاد رکھیں!!! اس طرح کے لوگوں کو شریعت اس طرزِ عمل کی تعلیم نہیں دیتی، بلکہ سیرتِ نبوی اور سیرتِ صحابہؓ تو حلال طریقے سے کسبِ معاش کی تعلیم دیتی ہے۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ سبق ملتا ہے کہ اپنا کر کے کھاؤ، دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تونگری کی وجہ سے آج کے دور میں ہمارا دین وایمان محفوظ رہے گا، ورنہ اندیشہ

ہے کہ اختیاری فقر وفاقہ کہیں کفر وشرک کے قریب ہی نہ لے جائے۔ ہاں! اولیاء اللہ اور یقین وتوکل کے اعلیٰ درجہ پر فائز لوگوں کا معاملہ اور ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی زریں نصائح

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: گزشتہ زمانہ میں مال کو بُرا سمجھا جاتا تھا، لیکن جہاں تک آج کے زمانہ کا تعلق ہے تو اب مال ودولت مسلمانوں کی ڈھال ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ: اگر یہ درہم ودینار اور روپیہ پیسہ نہ ہوتا تو یہ سلاطین وامراء ہمیں دست وپاہ بنا کر ذلیل وپامال کرڈالتے۔ نیز! انہوں نے فرمایا: کسی شخص کے پاس اگر تھوڑا بہت بھی مال ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی اصلاح کرے، کیوں کہ ہمارا یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی محتاج ومفلس ہوگا تو اپنے دین کو اپنے ہاتھ سے گنوانے والا سب سے پہلا شخص وہی ہوگا:

’’عن سفيان الثوری رحمه الله قال: كانَ الْمالُ فِيما مَضىٰ يُكرَه، فأمَّا الْيومَ فهُو تُرسُ المُؤمِنِ، وقال: لو لا هٰذِهِ الدَّنانِيرُ لتَمَنْدَلَ بنا هؤلآء المُلوكُ، وقال: مَن كانَ فِي يدِهٖ مِن هٰذهٖ شيئٌ فليُصلِحهُ، فإنَّهٗ زَمانٌ إنِ احْتَاجَ كانَ أوّلُ مَنْ يَبْذُلُ دِينَهٗ۔‘‘ (حلیۃ الأولیاء طبقات الأصفیاء، سفیان الثوری، ج:۶، ص:۳۸۱)

توضیحات شرح مشکاۃ میں لکھا ہے: ’’فيما مضٰى يكره‘‘، یعنی پچھلے زمانہ میں مال ودولت کو ناپسند کیا جاتا تھا، مؤمن اور متقی حضرات مال کو مکروہ سمجھتے تھے، کیوں کہ عام ماحول زہد وتقویٰ کا تھا، لوگ غریب وفقیر کو ذلیل وفقیر نہیں سمجھتے تھے، مالی کمزوری کی وجہ سے اس کے ایمان کو تباہ نہیں کرتے تھے، نیز بادشاہ اور حکمران بھی اچھے ہوتے تھے جو غریب کو سنبھالا دیتے تھے، اس لیے لوگ مال ودولت اکٹھا نہیں کرتے تھے اور اکٹھا کرنے کو معیوب سمجھتے تھے، مگر اب معاملہ اس کے برعکس ہے کہ غریب وفقیر آدمی کو معاشرہ میں ذلیل وحقیر سمجھتے ہیں، اور پیسے کی بنیاد پر اس کے ایمان کو خریدا جاتا ہے، نیز! حکمران بھی خیر خواہ نہیں رہے، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ غریب آدمی مالداروں اور حکمرانوں کا دستِ نگر اور دست وپاہ بن جائے گا، اور ان کے ہاتھ صاف کرنے اور میل کچیل صاف کرنے کے لیے تولیہ اور رومال بن جائے گا۔

پھر مزید لکھا ہے: جس شخص کے پاس اس مال میں سے کچھ بھی ہو وہ اس کی اصلاح کرے، مطلب یہ کہ تھوڑا پیسہ بھی ہو تو اس کو کسی کاروبار میں لگادیں یہ اس کی ترقی وبڑھوتری ہے، یا پھر اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ اس کو قناعت کے ساتھ خرچ کرے، اسراف نہ کرے۔ (ج:۷، ص:۳۷۵، مکتبہ عصریہ، کراچی)

کمائی کے ذرائع

کسب معاش کے بہت سے ذرائع ہیں، ان میں سے کون سا افضل ہے؟! اس کی تعیین میں سلف

صالحین کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بہترین کتاب ''فضائلِ تجارت'' سے خلاصۃً کچھ بحث ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک کمائی کے ذرائع تین ہیں: تجارت، زراعت اور اجارہ۔ اور ہر ایک کے فضائل میں بہت کثرت سے احادیث ہیں۔ بعض حضرات نے صنعت وحرفت کو بھی اس میں شامل کیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، میرے نزدیک وہ ذرائع آمدنی میں نہیں، اسبابِ آمدنی میں ہے اور آمدنی کے اسباب بہت سے ہیں: ہبہ ہے، میراث ہے، صدقہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جنہوں نے اس کو کمائی کے اسباب میں شمار کیا، میرے نزدیک صحیح نہیں، اس لیے کہ نرا صنعت وحرفت کمائی نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایک شخص کو جوتے بنانے آتے ہیں یا جوتے بنانے کا پیشہ کرتا ہے، وہ جوتے بنا بنا کر کوٹھی بھر لے، اس سے کیا آمدنی ہوگی؟ یا تو اس کو بیچے گا یا (پھر یہ جوتے) کسی کا نوکر ہو کر اس کا (مال) بنائے۔ یہ دونوں طریقے تجارت یا اجارہ میں آ گئے، اور اس سے بھی زیادہ قبیح ''جہاد'' کو کمائی کے اسباب میں شمار کرنا ہے، اس لیے کہ جہاد میں اگر کمائی کی نیت ہو گئی تو جہاد ہی باطل ہے .... میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک تجارت افضل ہے، وہ بحیثیت پیشہ کے ہے، اس لیے کہ تجارت میں آدمی اپنے اوقات کا مالک ہوتا ہے، تعلیم وتعلم، تبلیغ، افتاء وغیرہ کی خدمت بھی کر سکتا ہے، لہٰذا اگر اجارہ دینی کاموں کے لیے ہو تو وہ تجارت سے بھی افضل ہے، اس لیے کہ وہ واقعی دین کا کام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہی دین کا کام مقصود ہو اور تنخواہ بدرجۂ مجبوری ہے۔ میرے اکابرِ دیوبند کا زیادہ معاملہ اسی کا رہا، اور اس کا مدار اِس پر ہے کہ کام کو اصل سمجھے اور تنخواہ کو اللہ کا عطیّہ، اس لیے اگر کسی جگہ پر کوئی دینی کام کر رہا ہو: تدریس، افتاء وغیرہ اور اس سے زیادہ کسی دوسرے مدرسہ میں تنخواہ ملے، تو پہلی جگہ کو محض کثرتِ تنخواہ کی وجہ سے نہ چھوڑے۔ میں نے جملہ اکابر کا یہ معمول بہت اہتمام سے ہمیشہ دیکھا، جس کو آپ بیتی نمبر: ۶، صفحہ: ۱۵۵ میں لکھوا چکا ہوں کہ انہوں نے اپنی تنخواہوں کو ہمیشہ اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھا .... درحقیقت میرے اکابر کے بہت سے واقعات اس کی تائید میں ہیں کہ تنخواہ اصل یا معتد بہ چیز نہیں سمجھتے تھے، جیسا میں نے اوپر لکھا اور تنخواہ محض عطیۂ الٰہی سمجھتے تھے، جو ہم لوگوں میں بالکل مفقود ہے، یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر میں نے اجارۂ تعلیم کو سب انواع سے افضل لکھا ہے .... اس ملازمت کے بعد تجارت افضل ہے، اس لیے کہ تاجر اپنے اوقات کا حاکم ہوتا ہے، وہ تجارت کے ساتھ دوسرے دینی کام تعلیم، تدریس، تبلیغ وغیرہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تجارت کی فضیلت میں مختلف آیات واحادیث ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔'' (التوبۃ:۱۱۱)

''خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اور اس کے) عوض

میں اُن کے لیے بہشت (تیار) کی ہے۔''

اور بھی بہت سی آیات تجارت کی فضیلت میں ہیں، ان کے علاوہ احادیث میں ہے:

''التاجر الصدوق الأمین مع النبیین والصدیقین والشھدآء۔'' (سنن الترمذی، کتاب البیوع، التجار وتسمیۃ النبی ﷺ إیاھم، رقم الحدیث:۱۲۰۹)

''سچا، امانت دار تاجر (قیامت میں) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

''إن أطیب الکسب کسب التجار الذین إذا حدّثوا لم یکذِبوا، وإذا ائتمنوا لم یخونوا، وإذا وعدوا لم یُخلفوا، وإذا اشتروا لم یذموا، وإذا باعوا لم یمدحوا، وإذا کان علیھم لم یمطُلوا، وإذا کان لھم لم یعسروا۔''

(شعب الإیمان للبیہقی، الرابع والثلاثون من شعب الإیمان وھو باب فی حفظ اللسان، رقم الحدیث:۴۸۵۴)

''بہترین کمائی اُن تاجروں کی ہے جو جھوٹ نہیں بولتے، امانت میں خیانت نہیں کرتے، وعدہ خلافی نہیں کرتے اور خریدتے وقت چیز کی مذمت نہیں کرتے (تاکہ بیچنے والا قیمت کم کر کے دے دے) اور جب (خود) بیچتے ہیں تو (بہت زیادہ) تعریف نہیں کرتے (تاکہ زیادہ ملے) اور اگر ان کے ذمہ کسی کا کچھ نکلتا ہو تو ٹال مٹول نہیں کرتے اور اگر خود ان کا کسی کے ذمہ نکلتا ہو تو وصول کرنے میں تنگ نہیں کرتے۔''

''عن أنس رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: ''التاجر الصدوق تحت ظل العرش یوم القیامۃ۔'' (اتحاف الخیرۃ المھرۃ بزوائد المسانید العشرۃ، کتاب الفتن، باب فی التلاعن وتحریم دم المسلم، رقم الحدیث:۷۷۵۲)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کرم ﷺ نے فرمایا کہ: سچ بولنے والا تاجر قیامت میں عرش کے سایہ میں ہوگا۔''

''عن أبی أمامۃ رضی اللّٰہ عنہ أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: ''إن التاجر إذا کان فیہ أربع خصال طاب کسبہ، إذا اشتریٰ لم یذُمّ، وإذا باع لم یمدح، ولم یدلُس فی البییع، ولم یَحلِف فیما بین ذٰلک۔'' (الترغیب والترھیب، کتاب البیوع، رقم الحدیث:۲۷۹)

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ جب تاجر میں چار باتیں آجائیں تو اس کی کمائی پاک ہو جاتی ہے، جب خریدے تو اس چیز کی مذمت نہ کرے اور بیچے تو (اپنی چیز کی بہت زیادہ) تعریف نہ کرے اور بیچنے میں گڑ بڑ نہ کرے اور خرید و فروخت میں قسم نہ کھائے۔''

''وعن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: ''البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا البیعان وبیّنا بُورک لھما فی بیعھما، وإن کتما وکذَبا فعسیٰ أن یربَحا ربحاً ویمحقا برَکۃَ بیعھما۔'' (صحیح البخاری، کتاب البیوع، رقم الحدیث:۲۱۱۴)

''حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خرید وفروخت کرنے والے کو (بیع توڑنے کا) حق ہے، جب تک وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ اگر بائع ومشتری سچ بولیں اور مال اور قیمت کے عیب اور کھرے کھوٹے ہونے کو بیان کر دیں تو ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر عیب کو چھپالیں اور جھوٹے اوصاف بتائیں تو شاید کچھ نفع تو کمالیں، (لیکن) بیع کی برکت ختم کر دیتے ہیں۔''

''تسعة أعشار الرزق فی التجارة، والعشر فی المواشی، یعنی: النتاج۔''

(نظام الحکومۃ النبویۃ المسمّی التراتیب الإداریۃ، المقدمۃ الخامسۃ، باب ما ذکر فی الأسواق، ج:۲،ص:۱۲)

''فرمایا: رزق کے نو حصے تجارت میں ہیں اور ایک حصہ جانوروں کی پرورش میں ہے۔''

''أخرج الدیلمی عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما: ''أوصیکم بالتجار خیرا، فإنہم بُردُ الآفاق وأُمَناءُ اللّٰہ فی الأرض۔'' (حوالہ بالا)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہیں تاجروں کے ساتھ خیر کے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں، کیوں کہ یہ لوگ ڈاکیے اور زمین میں اللہ کے امین ہیں۔''

تجارت کے بعد میرے نزدیک زراعت افضل ہے، زراعت کے متعلق حدیث میں آیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ: ''کوئی مسلمان جو درخت لگائے یا زراعت کرے، پھر اس میں سے کوئی انسان یا پرندہ یا کوئی جانور کھالے تو یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔ اور مسلم کی روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس میں سے کچھ چوری ہو جائے تو وہ بھی اس کے لیے صدقہ شمار ہوتا ہے۔

اور ضرورت کے اعتبار سے بھی زراعت اہم ہے، کیوں کہ اگر زراعت نہ کی جائے تو کھائیں گے کہاں سے؟! ..... باقی اپنی زمین دوسرے کو دینا، مزارعت کہلاتا ہے، زراعت اور چیز ہے اور مزارعت اور چیز ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قواعدِ شرعیہ کی رعایت ہر چیز میں ضروری ہے، جیسا کہ اس بارے میں أوجز المسالک، ج:۵،ص:۲۲۰، باب کراء الأرض میں بہت لمبی بحث کی گئی ہے۔ اور شرعی حدود کی رعایت ان ہی تینوں میں نہیں بلکہ دین کے ہر معاملہ میں ضروری ہے۔ ان سب کے بعد نہایت ضروری اور اہم امر یہ ہے کہ کسب کے بلکہ ہر عمل میں شریعتِ مطہرہ کی رعایت ضروری ہے، جس کو احیاء العلوم، ج:۲،ص:۶۴ میں مستقل باب کے تحت بیان کیا ہے، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''بیع اور شراء کے ذریعہ مال حاصل کرنے کے مسائل سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے، جو اس مشغلہ میں لگا ہوا ہو، کیوں کہ طلبِ علم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس سے ان تمام مشاغل کا علم طلب کرنا مراد ہوگا، مشغلہ رکھنے والوں کو جن مسائل کی حاجت ہو۔ اور کسب کرنے والا کسب کے مسائل جاننے کا محتاج ہے اور جب اس سلسلہ کے احکام جان لے تو معاملات کو فاسد کرنے والی چیزوں سے واقف ہو

www.banuri.edu.pk

جائے گا، لہٰذا ان سے بچے گا، اور ایسے شاذ ونادر مسائل جو باعث اشکال ہوں ان کے ہوتے ہوئے معاملہ کرنے میں سوال کر کے علم حاصل کرنے تک توقف کرے گا، کیوں کہ جب کوئی شخص معاملات کو فاسد کرنے والے امور کو اجمالی طور پر نہ جانے تو اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کے بارے میں توقف کروں اور سوال کر کے اس کو جانوں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں پیشگی علم حاصل نہیں کرتا، اس وقت تک کام کرتا رہوں گا جب تک کوئی واقعہ پیش نہ آجائے، جب کوئی واقعہ پیش آئے گا تو معلوم کرلوں گا، تو اس شخص کو جواب دیا جائے گا کہ جب تک تو اِجمالی طور پر معاملات کو فاسد کرنے والی چیزوں کو نہ جانے گا تجھے کیسے پتہ چلے گا کہ مجھے فلاں موقع پر معلوم کرنا چاہیے۔ جسے اجمالی علم بھی نہ ہو وہ برابر تصرفات کرتا رہے گا اور ان کو صحیح سمجھتا رہے گا۔ لہٰذا علم تجارت سے اوّلاً اس قدر جاننا ضروری ہے کہ جس سے جائز وناجائز میں تمیز ہو اور یہ پتہ چل سکے کہ کون سا معاملہ وضاحت کے ساتھ جائز ہے اور صحیح ہے، اور کس میں اشکال ہے۔'' (ملخص من فضائل تجارت، ص: ۴۸-۲۷، مکتبۃ البشریٰ)

اِن تفصیلات کے بعد ہم سب کے لیے از حد ضروری ہے کہ ہم حدودِ شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے کسبِ معاش کریں، اور حصول معاش سے قبل اس کا علم شرعی ضرور بالضرور حاصل کرلیں، مبادا یہ کہ یہ کمائی کل بروزِ قیامت ہمارے لیے وبال بن جائے اور ہماری آخرت برباد ہوجائے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: ہمارے بازار میں وہی شخص خرید وفروخت کیا کرے، جس نے اپنے اس کاروبار سے متعلق علم حاصل کرلیا ہو۔

''لا یبیع فی سوقنا إلا من قد تفقه فی الدین۔'' (سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، رقم الحدیث: ۴۸۷)

اللہ رب العزت زندگی کے ہر ہر شعبے میں احکامات معلوم کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

أللّٰهم انفعْنا بما عَلَّمْتَنا وعلِّمْنا ما يَنفعُنا وارزُقْنا علماً تنفعُنا بهٖ

اللہ تعالیٰ کو ’’خدا‘‘ یا کسی اور نام سے پکارنا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

معارف القرآن جلد چہارم صفحہ:۱۳۰ پر سورۃ الاعراف کی آیت:۱۸۰ ’’**وَلِلّٰہِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوْا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ أَسْمَائِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ**‘‘ کے تحت معارف ومسائل میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ’’اس (اللہ تعالیٰ) کے پکارنے کے لیے بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو الفاظ چاہے اختیار کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں وہ الفاظ بھی بتلا دیئے جو اس کی شایانِ شان ہیں اور ہمیں پابند کردیا کہ انہی الفاظ کے ساتھ اس کو پکاریں‘‘۔ پھر چند سطور کے بعد صفحہ:۱۳۲ پر لکھا ہے کہ ’’تمام علماء حق کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ جو چاہے نام رکھ لے یا جس صفت کے ساتھ چاہے اس کی حمد وثناء کرے، بلکہ صرف وہی الفاظ ہونا ضروری ہیں جو قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لیے بطور نام یا صفت ذکر کیے گئے ہیں۔‘‘

۱:- اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انگریزی میں (God) گوڈ یا ہندی میں بھگوان یا اردو اور فارسی میں خدا کہنا جس کا عام رواج ہے، جائز نہیں۔

۲- لفظ اللہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا اسم ذات ہے، کیا اس اسم ذات کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا جیسا کہ بعض تراجم میں پایا جاتا ہے، جائز ہے؟ اس مسئلہ کی پوری وضاحت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔ جزاکم اللّٰہ تعالیٰ

مستفتی: عبداللہ، کراچی

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

واضح رہے کہ کسی بھی زبان سے تعلق رکھنے والا شخص اگر ایسا لفظ بولے جو معبودِ حقیقی کی نشاندہی کرتا ہے اس لفظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارنا درست ہے جیسے خدا، ایزد، یزداں، گوڈ وغیرہ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے اور لفظ خدا واجب الوجود ہی کی ترجمانی کرتا ہے، کیونکہ لفظ خدا دولفظوں سے مل کر بنا ہے ایک ''خود'' دوسرا ''آ''، تو معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود واجب ہے یعنی بغیر کسی کی احتیاج کے ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ خدا کا استعمال بلاکراہت جائز ہے، نیز اسی طرح لفظ گوڈ سے بھی صاحب لسان کا اللہ ہی کو پکارنا ہوتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، منع وہ لفظ ہے جو کسی قوم کا شعار بن چکا ہو اور اس سے اس قوم کی پہچان ہو، جیسے لفظ بھگوان کہ اگرچہ اس سے صاحب لسان کا اللہ ہی کو پکارنا ہو، لیکن ان کا یہ شعار بن چکا ہے، لہٰذا اس لفظ سے پکارنے سے احتراز کیا جائے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے:

''الاسم العاشر قولنا واجب الوجود لذاته......وقولهم بالفارسية خداى معناه أنه واجب الوجود لذاته لأن قولنا خداى مركبة من لفظتين فى الفارسية، أحدهما ''خود'' ومعناه ذات الشيئ ونفسه وحقيقته والثانية قولنا ''آى'' معناه جاء، فقولنا خداى معناه أنه بنفسه جاء وهو إشارة إلى أنه بنفسه وذاته جاء إلى الوجود لابغيره وعلى هذا الوجه فيصير تفسير قولهم خداى أنه لذاته كان موجودا۔'' (تفسیر کبیر، ص:۱۰۰، ۱۰۱ الباب الثالث من ہذا الکتاب فی مباحث الاسم)

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرماتے ہیں:

''فإن قلت: فهل يعم تعظيم الأسماء جميع الألفاظ الدائرة على ألسنة الخلق علىٰ اختلاف طبقاتهم وألسنتهم؟ فالجواب نعم، هى معظمة فى كل لغة مرجعها إلى ذات واحدة فان اسم اللّٰه لايعرف العرب غيره وهو بلسان فارسى خدا، أى بلسان الحبشة ''واق'' وبلسان الفرنجى ''كريطر دروا'' بحث على ذلك فى سائر الألسن تجد ذلك اسم الإلٰهى معظما فى كل لسان من حيث لايدل عليه''۔ (الیواقیت والجواہر، ص:۸۷، ط:مصری)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ امداد الفتاویٰ میں فرماتے ہیں:

''من الأسماء التوقيفية علم ومنها ألقاب وأوصاف وترجة اللفظ بمنزلته فالأسماء العجمية ترجمة تلك الألقاب والأوصاف ولذا انعقد الإجماع على إطلاقها، نعم لايجوز ترجمة العلم فاللّٰه عَلَمٌ والباقى ألقاب وأوصاف بخلاف المرادف العربى للأسماء العربية لأنها لاضرورة إلى إطلاقها فلا يؤذن فيها، أما العجم فيحتاجون إلى الترجمة للسهولة فى الفهم، هذا ما عندى ولعل عند غيرى ماهو أحسن من هذا''۔ (امداد الفتاویٰ، ج:۴، ص:۵۱۳، ۵۱۴، ط: دارالعلوم کراچی مسائل شتی)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

''مگر اس صورت میں ان ہی ناموں کو منع کیا جاسکتا ہے جو غیرقوم کا شعار ہیں اور جو شعار نہیں ان کو منع نہیں جاسکتا، جیسے خدا، ایزد، یزداں کہ یہ نام کسی مخصوص غیرمسلم کے شعار نہیں، بلکہ بکثرت اہل اسلام کی تصانیف میں موجود ہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ، ج:۱، ص:۲۷۱، ط: ادارۃ الفاروق)

نیز لفظ گاڈ سے کسی شخص کے بے ادبی کرنے سے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا:

''اپنے محاورات اور بول چال میں اللہ تعالیٰ کا ایسا نام لینا اولیٰ اور مناسب ہے جو قرآن شریف اور حدیث شریف سے ثابت ہو، تاہم ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں ان کا بھی ادب واحترام لازم ہے۔ یہ بات جانتے ہوئے کہ فلاں لفظ اللہ تعالیٰ کا نام ہے اس کی بے ادبی کرنے کا حق نہیں، اس سے پورا پرہیز لازم ہے۔'' (فتاویٰ محمودیہ، ج:۱،ص:۲۶۷،۲۶۸، ط:ادارۃ الفاروق)

اور حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تفسیر سے مراد لفظ خدا وغیرہ کا اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرنے کی نفی کرنا نہیں، بلکہ جو اسماء اللہ رب العزت کے توقیفی ہیں اس لفظ کو چھوڑ کر اسی عربی زبان میں اس کا ہم معنی مترادف لفظ استعمال کرنا درست نہیں، جیسے کہ اللہ رب العزت کی ایک صفت کریم ہے اس کو چھوڑ کر سخی کہنا یا شافی کے بجائے طبیب کہنا یا نور کے بجائے ابیض کہنا درست نہیں، جیسا کہ امداد الفتاویٰ کے گزشتہ حوالے کی عبارت سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے اور حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس لفظ ''خدا'' کو صفحہ:۱۳۳ پر استعمال کیا ہے۔

لہذا سائل اس عبارت کے ظاہر سے جو سمجھے ہیں وہ درست نہیں۔

۲- جی ہاں لفظ اللہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا اسم ذات ہے جس کا ایک معنی ''وہ ذات کہ جو مستحق ہے اس بات کی کہ اس کی عبادت کی جائے'' اور ایک معنی ''واجب الوجود ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا''۔ چنانچہ تفسیر القرطبی میں ہے:

''فاللّٰہ اسم للموجود الحق الجامع لصفات الإلٰهية المنعوت بنعوت الربوبية المنفرد بالوجود الحقيقى لا إله إلا هو سبحانه وقيل: معناه الذى يستحق أن يعبد، وقيل: معناه واجب الوجود الذى لم يزل ولايزال والمعنى واحد''۔

(تفسیر القرطبی، ج:۱،ص:۱۰۲، ط: دار الکتب المصریہ، القاہرۃ)

تفسیر البیضاوی میں ہے:

''وقيل علم لذاته المنصوصة لأنه يوصف ولايوصف به''۔ (تفسیر البیضاوی، ج:۱،ص:۱۳)

اور بہتر یہ ہے کہ لفظ اللہ کا ترجمہ لفظ اللہ سے ہی کیا جائے، لیکن تفہیم کی غرض سے دوسری زبان میں اس کا ایسے الفاظ سے ترجمہ کرنا جس سے حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا تعارف ہو درست ہے۔ فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد انعام الحق	محمد عبد القادر	محمد نوید

دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن